آپ بیتیاں

محمد یوسف وسیر

آپ بیتیاں

محمد یوسف وسیر

سید پبلیکیشنز اردو بازار لاہور

مصنف: محمد یوسف وسیر

کمپوزنگ: مائیوز

پبلشرز: سید پبلیکیشنز، اردو بازار لاہور

بار اول: ۲۰۲۴ء

قیمت: ۴۸۰ روپے

انتساب

اپنے بچوں کے نام

پیش لفظ

ادب انسان کے باطن کی بازگشت ہے—ایک ایسا آئینہ جو لفظوں کی کرنوں سے منقش ہو کر روح کے اندر چھپے ہوئے جذبات، احساسات اور مشاہدات کو منعکس کرتا ہے۔ مگر بعض اوقات یہ آئینہ صرف انسانوں کے چہروں کو نہیں، ان بے جان اشیاء کے نقوش کو بھی ظاہر کرتا ہے جو ہماری روزمرہ زندگی کے گرد کسی خاموش گواہ کی طرح موجود ہوتی ہیں۔ وہ اشیاء جنہیں ہم محض استعمال کی چیزیں سمجھتے ہیں، دراصل وقت کی مٹی میں دفن کہانیاں، خواب، زخم اور یادیں اپنے اندر سموئے بیٹھی ہیں۔

یہی احساس اس کتاب ''آپ بیتیاں'' کی بنیاد بنا۔ یہاں بولنے والے لب انسان کے نہیں، بلکہ اُن کرسیوں، قلموں، کتابوں، کپڑوں اور دیواروں کے ہیں جو انسان کی تاریخ کے تماشے کے گرد خاموش بیٹھے رہے، مگر سب کچھ دیکھتے، سنتے، محسوس کرتے رہے۔ ان کی آپ بیتیاں گویا وقت کے خزانے سے نکلے وہ خطوط ہیں جو انسان نے خود لکھے، مگر بھیجے نہیں۔

خودنوشت یا آپ بیتی دراصل ایک آئینہ ہے جس میں فرد اپنی زندگی کے خدوخال دیکھتا اور دکھاتا ہے۔ یہ محض ماضی کی روداد نہیں، بلکہ خودشناسی کا ایک مقدس عمل ہے—ایسا عمل جس میں انسان اپنے باطن کی تہوں میں اتر کر اپنے وجود کی کہانی کو لفظوں کا پیرہن دیتا ہے۔ تاہم جب یہی زاویہ کسی غیرِ انسانی وجود کو دیا جائے، تو وہ آئینہ اور بھی عجیب روشنی اختیار کر لیتا ہے۔ کرسی جب اپنی آپ بیتی لکھتی ہے تو وہ دراصل طاقت اور تھکن کی تمثیل بن جاتی ہے؛ ایک قلم جب اپنی زندگی کا حال بیان کرتا ہے تو وہ علم کی خوشبو اور انسانی حماقتوں کی گرد دونوں سے بوجھل نظر آتا ہے۔

ان تحریروں میں ہر شے اپنے وجود کے کرب اور اپنی معنویت کے شعور کے ساتھ بول اٹھتی ہے۔ ان میں کہیں ایک پرانی کتاب اپنی زرد اور بوسیدہ جلد کے پیچھے سے علم و جہالت کی جنگوں کی گواہی دیتی ہے؛ کہیں ایک کوٹ انسان کی طبقاتی

تقسیم کا نشان بن کر اپنے مالک کے غرور اور شکست دونوں کو سنبھالے کھڑا ہے؛ کہیں ایک کرسی اقتدار کے بوجھ سے کراہتی ہے، اور کہیں ایک چراغ اپنی لو میں بجھتے ہوئے خوابوں کا ماتم کرتا ہے۔

یہ اشیاء، جو بظاہر بے جان ہیں، درحقیقت انسانی معاشرے کی علامتی خودیاں ہیں۔ان کے ذریعے وہ سارے دکھ، سوالات اور تضادات نمایاں ہوتے ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی کی بنیادوں میں پوشیدہ ہیں۔ان آپ بیتیوں کا مطالعہ محض تفننِ طبع نہیں بلکہ ایک سماجی مکاشفہ ہے، جو بتاتا ہے کہ انسان کی بنائی ہوئی ہر چیز آخرکار خود انسان ہی کا عکس بن جاتی ہے۔

اردو ادب میں خودنوشت کی روایت ایک نازک مگر معنوی سفر رکھتی ہے۔مولوی عبدالحق سے لے کر مولانا شبلی نعمانی تک، سرسید سے لیکر خواجہ حسن نظامی تک، ہر ایک نے اپنی زندگی کے دریچوں کو لفظوں سے روشن کیا۔مگر یہ روایت زیادہ تر انسانی تجربے تک محدود رہی۔اس کتاب نے اس روایت میں ایک نیا زاویہ پیدا کیا ہے— غیر انسانی خودنوشت کی روایت — جو نہ صرف تخیل کا نیا در کھولتی ہے بلکہ قاری کو اپنے گرد و پیش کی دنیا کے بارے میں نئے شعور سے روشناس کراتی ہے۔

ادب میں استعارہ محض فنی آرائش نہیں، بلکہ معنی کی توسیع ہے۔جب ایک کرسی بولتی ہے تو وہ محض لکڑی اور کیل کی بات نہیں کرتی، بلکہ اقتدار، رعب، امتیاز، تھکن، اور بغاوت کی علامت بن جاتی ہے۔جب ایک کتاب اپنی بیتی سناتی ہے تو اس کی سطروں میں صرف الفاظ نہیں، بلکہ صدیوں کا علم، انسان کی غلطیاں، اور زمانے کے تغیرات بولتے ہیں۔یوں ہر شے کا "میں" انسانی تاریخ کا ایک ٹکڑا بن جاتا ہے، اور ہر آپ بیتی ایک اجتماعی سوانح عمری میں بدل جاتی ہے۔

یہ کتاب اس بات کی گواہ ہے کہ احساس صرف گوشت پوست کے بدن میں نہیں رہتا، بلکہ مادّی چیزوں میں بھی ایک خاموش روح کارفرما ہوتی ہے

یوں یہ تحریریں ادب کی اس صنف کو ایک نئے شعری اور فکری معنی عطا کرتی ہیں۔یہاں آنسو زنگ میں بدل جاتے ہیں، خوشبو دھول میں چھپ جاتی ہے، اور وقت ایک ایسی شئے کے بدن میں سانس لیتا ہے جو بول نہیں سکتی مگر محسوس ضرور کرتی ہے۔

یہ "آپ بیتیاں" نہ صرف اشیاء کی زندگی کی روداد ہیں، بلکہ انسانی وجود کا آئینہ بھی ہیں۔ان کے مطالعے سے قاری محض ایک فنی تجربے سے نہیں گزرتا، بلکہ اپنے شعور کی تہوں میں جھانکنے لگتا ہے۔وہ سوچتا ہے کہ شاید وہ خود بھی ایک

ایسی شے ہے جو کسی اور کے تجربے میں معنی پاتی ہے۔ یوں انسان اور اشیاء کا فرق مٹنے لگتا ہے، اور دونوں ایک ہی داستان کے دو پہلو بن جاتے ہیں۔

آخر میں، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب کی ہر تحریر ایک چھوٹا سا فلسفیانہ مکالمہ ہے، جس میں اشیاء انسان سے سوال کرتی ہیں — کہ اگر ہمیں تم نے بنایا ہے تو پھر ہم تم سے خاموش کیوں رہیں؟ اگر تم نے ہمیں شکل دی ہے تو ہمارے زخموں کی ذمہ داری کس کی ہے؟ اور اگر تمہارے بغیر ہم بے معنی ہیں تو تمہارا وجود بھی ہماری مادی یادوں کے بغیر کہاں مکمل ہے؟

یہی وہ سوالات ہیں جو اس کتاب کو محض تخلیقی تجربہ نہیں، بلکہ ادبی و فکری جستجو بنا دیتے ہیں۔ یہاں ہر صفحہ ایک گواہی ہے — انسان کی تخلیق کی، اس کے زوال کی، اور اس خاموش کائنات کی جو ہر لمحہ ہمیں دیکھتی ہے، مگر ہم کبھی پلٹ کر نہیں دیکھتے۔

میری خواہش ہے کہ قاری جب ان آپ بیتیوں کو پڑھے تو اس کے دل میں یہ احساس جاگے کہ چیزیں بھی کبھی زندہ ہوتی ہیں، صرف اُن کی سانسوں کا انداز ہم سے مختلف ہوتا ہے۔ اور شاید یہی احساس ادب کی سب سے بڑی فتح ہے — کہ وہ زندگی کو وہاں بھی تلاش کر لے جہاں زندگی کے آثار مفقود نظر آتے ہیں۔

آپ بیتیاں

فہرست عنوانات

چائے کے کپ کی آپ بیتی

"میں وہی ہوں... جو کبھی جمال کا پیمانہ تھا، اور اب شکستگی کا نشان ہوں۔ میرے وجود کے ذرے یہاں بکھرے پڑے ہیں، انہی چٹانوں کے دامن میں، جہاں میرے آغاز کی ساعت رقم ہوئی تھی۔ جو کچھ میں ہوں، یا جو کچھ تھا، وہ تمہیں سنانا ہے، اے سننے والے"!

میں مٹی تھا... محض مٹی، لیکن وہ مٹی جسے زمین نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا، صدیوں سے، چپ چاپ۔ ایک دن سورج کی کرنیں کچھ یوں مڑیں کہ پہاڑیوں کے نیچے پوشیدہ خزانے کو بے نقاب کرنے کا وقت آن پہنچا۔ پہاڑیوں کی آغوش میں ایک نالا بہتا تھا، اور اس کے قریب ہی وہ جگہ تھی جہاں مجھے میرے عدم سے وجود کی طرف بلایا گیا۔

جب پہلی بار کدال کی ضرب میرے بدن پر پڑی، تو مجھے ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ یوں لگا جیسے کوئی ماں نیند میں کروٹ بدل رہی ہو۔ مزدور، جو میری کوکھ سے گزر کر روشنی کی طرف آتے تھے، خود تاریکی کی مخلوق لگتے تھے۔ ان کے چہرے گرد و غبار سے اٹے ہوئے، بدن پسینے میں شرابور، اور آنکھوں میں خوابوں کی بجائے ایک عجیب خالی پن تھا۔ ان کے ہاتھ کھردرے تھے، جن پر کبھی کبھی میری نمی جم جاتی اور پھر خشک ہو کر چھلکے کی مانند جھڑ جاتی۔

ان مزدوروں کے جملے، جن میں تھکن، قناعت اور کبھی کبھی تلخی کے رنگ گھلے ہوتے، میری گہرائیوں میں گونجتے۔ وہ کہتے:

"اوے بشیرے، یہ مٹی ہمیں کیا دے گی؟"

اور بشیر ہنستا، ایک ایسی ہنسی جو امید کی بجائے عادت تھی، اور کہتا:

"اگر اس نے کچھ نہ دیا تو ہم اس کو کچھ دے دیں گے"!

میرے اردگرد پہاڑ خاموش تھے، لیکن ان کی خامشی میں ایک گہرا نوحہ پنہاں تھا۔ شاید وہ جانتے تھے کہ جس مٹی کو نکالا جا رہا ہے، وہ ایک دن اپنے آغاز کی طرف لوٹ آئے گی — ٹوٹ پھوٹ کر، بکھر کر، فنا ہو کر۔

مٹی نکالنے کا عمل صرف کدال یا بیلچے کی ضرب نہیں تھا، بلکہ وہ مزدور میری تہوں کو کاٹتے، میرے جسم کو چھانتے، اور بار بار پانی ڈال کر میری روح سے فالتو پتھریلے ذرات الگ کرتے۔ پھر مجھے ٹوکریوں میں بھر کر، پیٹھ پر لاد کر، نیچے وادی کی طرف لے جایا جاتا۔ وہ ٹوکریاں، جن میں میں سمٹی ہوتی، مزدوروں کے بوجھ کی علامت تھیں، لیکن میرے لیے وہ گویا پالنے کی مانند تھیں۔

کارخانے تک کا سفر کسی جلوس جنازہ سے کم نہ تھا۔ میں نہ تھی، لیکن مٹی تھی؛ نہ انسان، نہ چرند، لیکن زندگی کی بنیاد تھی۔

کارخانے کی فضا میں دھواں، حرارت، اور لوہے کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ وہاں مجھے اک ٹھنڈی تاریکی والے کمرے میں رکھا گیا، جہاں میرے جیسے اور بھی مٹی

کے ڈھیر موجود تھے۔ کچھ مجھ سے پرانی، کچھ نئی، اور کچھ ایسی جن میں ابھی نمی باقی تھی۔

اس کمرے میں پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ مٹی ہونا، صرف خاک ہونا نہیں، بلکہ ایک مقدر کا آغاز ہے۔ میرے ساتھ والی مٹی اکثر بڑبڑاتی تھی:

"کاش یہ ہمارا آخری سفر ہو"

لیکن میں خاموش تھی۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا، میرے اندر کوئی ایسی خلش ہے جو سادہ مٹی سے کچھ اور بننے کی خواہشمند ہے۔

وقت گزرا، اور کارخانے کے مزدور آئے۔ انہوں نے میری مٹی کو ایک بڑے کنوئیں نما گڑھے میں پھینکا، جہاں مجھے پانی میں بھگو کر بار بار رگڑا گیا۔ میں ایک خمیر بننے لگی، ایک ایسی صورت جو نہ صلب تھی نہ نرم، ایک بیچ کی حالت، جو شاید زندگی اور عدم کے بیچ کی مانند تھی۔

میری گردن جھکی ہوئی تھی، لیکن اندر کہیں ایک چمک تھی۔ میں جانتی تھی، یہ سفر مشکل ہے، لیکن میرے اندر وہ توانائی ہے جو مجھے "کچھ" بنائے گی۔

"جب میں مٹی تھی تو خاموش تھی، لیکن جب خمیر بنی، تو بولنے لگی۔ یہ بولنا جسم کا نہیں، روح کا عمل تھا۔ میں اب محض ایک ذرے کی مانند نہ تھی، میں خواب کی شکل اختیار کر رہی تھی۔"

مجھے کنویں نما گڑھے میں کئی روز بھگو کر رکھا گیا۔ میرے اندر کی سختی تحلیل ہونے لگی، ذرا ذرا سا میں پانی میں گھل گئی، جیسے کوئی پرانی یاد آنسو میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ پھر کارخانے کے مزدور، جن کے ہاتھوں میں وقت کے نشانات نقش تھے، مجھے لوہے کے بڑے پیالوں میں ڈال کر بار بار چھاننے لگے۔ میری روح کے پتھریلے ٹکڑے الگ کیے گئے، جیسے کوئی صوفی دل کی صفائی کے لیے دنیاوی لالچ چھانتا ہے۔

اب میں خمیر تھی — نرم، لیکن معنی خیز۔ میں گوندھی گئی، دبائی گئی، بار بار پلٹی گئی۔ مزدوروں کے ہاتھوں کی گرمی میرے بدن میں اتری، اور مجھے لگا جیسے کوئی سنگت عطا ہو گئی ہو۔ پھر مجھے سانچے کی طرف لے جایا گیا — ایک ایسا لمحہ جب وجود کو صورت دی جاتی ہے، اور صورت کو مقصد۔

سانچہ ایک گول خاکی ساخت تھی، جس میں خمیر کو ڈالا گیا۔ ایک لمحے کو میں منتشر ہوئی، پھر اکائی بنی۔ مجھے ایک خاص زاویے پر گھمایا گیا، جیسے کسی رقص کی مدھم لے پر کسی درویش کو گھمایا جاتا ہے۔ ہر چکر کے ساتھ میرا وجود توازن اختیار کرتا گیا، میرا پیندہ بننے لگا، میرے کنارے اُبھرتے گئے، میری صورت واضح ہونے لگی۔

"میں بن رہی تھی۔ اب میں صرف مٹی نہ تھی، میں ایک 'کپ' تھی، جو کچھ سمیٹے گا، جو کچھ پیش کرے گا۔"

پھر مجھے خشک ہونے کے لیے رکھا گیا۔ دھوپ میرے بدن پر اتری، جیسے قدرت میرے وجود کو سند دے رہی ہو۔ آہستہ آہستہ میری رطوبت اڑ گئی، اور میں سخت ہونے لگی۔ پھر ایک کاریگر آیا، جو میرے وجود میں حسن کے رنگ بھرنے والا تھا۔ اس نے نہایت نرمی سے مجھے چھوا، میرے کنارے برابر کیے، میرا ہینڈل جوڑا، اور میری سطح کو ہموار کیا۔ اس کا ہاتھ لطیف تھا، لیکن نگاہ میں اک حکمت تھی۔

پھر میرے جسم پر چمک چڑھائی گئی — ایک شفاف تہہ، جو نہ صرف میری حفاظت کرتی تھی، بلکہ میرے حسن کو دوبالا کرتی تھی۔ جیسے روح کو تزکیہ ملے، ویسے ہی میں روشنی کی لَو میں نکھر گئی۔

"اب میں فقط ایک ظرف نہ تھی، میں ایک آئینہ تھی، جس میں وقت خود کو دیکھتا۔"

آخری مرحلہ بھٹی کا تھا۔ وہ بھٹی جس میں ہزاروں درجے کی گرمی تھی، لیکن اسی میں میرے وجود کی تکمیل تھی۔ میں داخل ہوئی، جیسے کوئی نفس آزمائش کے عالم میں قدم رکھے۔

گرمی میرے اندر اتری، میرے رگ و پے میں دوڑنے لگی، اور پھر یکدم ایک سکون سا آیا۔

"میں جل رہی تھی، لیکن مکمل ہو رہی تھی۔ جیسے کوئی عارف فراق کی آگ میں جل کر وصال کی روشنی پاتا ہے۔"

جب میں بھٹی سے نکلی، تو میں وہ نہ رہی تھی جو اندر گئی تھی۔ میری سطح شفاف تھی، میرے کنارے مکمل، میرا ہینڈل خم دار اور حسین، اور میری شکل متوازن۔

"میں کپ تھی۔ بل کہ میں کپ تھا، مجھے مونث سے مذکر بنا دیا گیا۔ لیکن صرف چائے کا نہیں، میں اُن تمام ہاتھوں، تمام سانسوں، تمام پسینوں کا نچوڑ تھا جنھوں نے مجھے بنایا۔ میں ایک مکمل پیکرِ فن تھا۔"

میرے ساتھ کچھ اور کپ بھی تھے، کچھ مجھ سے مختلف، کچھ ہم شکل۔ ہم سب کو ترتیب سے رکھا گیا، جیسے کسی دربار میں نئے شاہی ارکان کو کھڑا کیا جاتا ہے۔ ہر ایک کی چمک الگ، ہر ایک کا زاویہ جدا، لیکن سب میں ایک مشترک جذبہ تھا — فخر۔

مجھے الماری میں رکھا گیا، ایک سیاہ مخملی گدّے پر۔ میری چمک میں سورج کی کرنیں جھلملانے لگیں۔ میں جانتا تھا، اب میرا سفر بازار کی طرف ہے۔

"بازار — جہاں انسان نہیں، نظریے بکتے ہیں؛ جہاں چیزیں اپنے حسن کی بولی خود نہیں لگاتیں، بلکہ خریدار کی آنکھیں ان کا مول طے کرتی ہیں۔"

"میں ایک خاموش ظرف تھا، لیکن میرے اندر ایک صدا تھی — جسے صرف وہ سن سکتا تھا جس کے دل میں جمال کی کوئی لغزش باقی ہو۔ بازار، میری پہلی رونمائی کا مقام تھا؛ اور میں وہاں ایک خواب کی مانند رکھا گیا، جس کی تعبیر کسی اشرافیہ عورت کی انگلیوں کے لمس میں چھپی تھی۔"

مجھے ریشم کی نرم پٹیوں میں لپیٹ کر ایک بڑی سی گاڑی میں رکھا گیا۔ میرے ساتھ اور بھی بہت سے برتن تھے — کچھ پیالے، کچھ پلیٹیں، کچھ گلدان۔ لیکن ان سب کے بیچ، میں اپنے توازن، رنگت اور جاذبِ نظر ساخت کے سبب نمایاں تھا، گویا ایک معمولی مجمع میں کوئی شہزادہ۔

ہمیں ایک بڑے بازار میں اتارا گیا، جہاں شیشے کی الماریوں، سنگِ مرمر کے شیلفوں اور دھاتی ریکسوں کی قطاریں تھیں۔ ہوا میں ایک عجیب سا شور تھا، کچھ خریداروں کی سرگوشیاں، کچھ دکانداروں کی بڑھکیں، اور کچھ نرخوں کے سودے۔ یہ بازار صرف چیزوں کا نہیں تھا، یہ شوق کا بازار تھا، عزّت کی بولی کا مقام، جہاں چیزوں کی قیمت ان کی

خوبصورتی سے زیادہ، خریدار کی حیثیت طے کرتی تھی۔

میری نمائش ایک روشن کونے میں کی گئی۔ میرے نیچے نیلا مخمل تھا، اور اوپر سفید روشنی کی ایک پتلی دھار میری سطح پر جھلملا رہی تھی، جیسے چاندنی کسی تالاب میں لرزتی ہو۔ دکاندار، جو موٹی مونچھوں والا ایک شوخ فطرت آدمی تھا، ہر آتے جاتے خریدار کو میری طرف اشارہ کر کے کہتا:

یہ کپ نہیں شاہ کار ہے، فن کی معراج ہے، مصور کی روح ہے

کچھ لوگ آئے، مجھے دیکھا، انگلیوں سے چھوا، جھک کر اندر جھانکا، اور آگے بڑھ گئے۔ میں ان کی بے نیازی پر افسردہ نہ ہوا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ ہر جمال کی ایک مخصوص آنکھ ہوتی ہے، جو اس کو پہچانتی ہے۔

پھر ایک دن وہ لمحہ آ گیا جب میری قدر دانی کو عملی شکل ملنے والی تھی۔

ایک گاڑی رکی، اور اس میں سے ایک ہلکے آسمانی رنگ کی ساڑھی میں لپٹی خاتون اتری۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھی آیا تھی، جو جھکی ہوئی تھی، لیکن اس کی آنکھوں میں تیز نظر تھی۔ خاتون کے ہاتھوں میں مہندی کی سنہری جھلک تھی، اور اس کی چال میں وہ نرمی تھی جو کسی اعلیٰ خاندان کی پرورش میں آتی ہے۔

وہ دکان میں داخل ہوئی، اور ایک سادہ مسکراہٹ کے ساتھ دکاندار سے بولی:

" کپ چاہیے، جو منفرد ہو، جس میں صرف چائے نہیں، بھرم بھی رکھا جا سکے۔"

دکاندار نے فوراً میری طرف اشارہ کیا۔

" خاتون میرے قریب آئی، مجھے ہاتھوں میں اٹھایا۔ اس کا لمس نرم تھا، لیکن اس میں ایک وقار تھا۔ اس نے میری سطح پر انگلی پھیری، میرے کنارے کو لبوں کے قریب لایا، اور پھر آہستہ سے مسکرا کر بولی:

"*یہی ہو گا۔"

یوں، میں خرید لیا گیا — نہ ایک برتن کے طور پر، بلکہ ایک ذوق کی تکمیل کے لیے۔

مجھے ایک شاندار کوٹھی میں لایا گیا، جہاں سنگِ مرمر کی سیڑھیاں تھیں، اطلس کے پردے، اور فرشی قالین جیسے بادل زمین پر آ گئے ہوں۔ مجھے کچن کے شیشے والے کیبنٹ میں جگہ دی گئی، جہاں مجھ جیسے اور بھی نادر نمونے تھے، لیکن میں سب سے نمایاں تھا۔

گھر کے افراد الگ الگ مزاج کے تھے۔ صاحبِ خانہ، ایک سادہ، شریف النفس افسر تھے، جو چپ چاپ لوگوں کے

مسائل حل کرتے، اور ہر ملازم سے عزت سے پیش آتے۔ان کے ہونٹوں پر ہمیشہ ایک محتاط مسکراہٹ رہتی، اور نگاہوں میں توازن۔وہ جب چائے پیتے، تو کپ کو یوں تھامتے جیسے کوئی عالم کتاب کے ورق پلٹ رہا ہو۔

بیگم صاحبہ نفیس ذوق کی حامل، لیکن تھوڑی تفاخر پسند۔ملازمین کو وہ ایک خاص فاصلہ رکھ کر بلاتیں۔ان کے ہاتھوں میں کنگنوں کی کھنک اور زبان میں حکمرانی کی جھلک تھی۔

صاحبزادی، جدید تعلیم یافتہ، لیکن کسی قدر خود پسند۔ان کے لیے ہر چیز کا مقصد صرف "استعمال" تھا، محبت یا احترام کا عنصر ان کی لغت میں کم ہوتا جا رہا تھا۔

مگر ملازمین—ان کے ہاتھ، ان کی نظریں، ان کے تبصرے—میرے لیے ہمیشہ ایک بینام محبت سے بھرے رہے۔

یوں میری زندگی میں اک روشن دور آیا۔ ہر شام، میں چائے سے لبریز، افسرِ عالی مقام کے ہونٹوں کو چھوتا، اور اس کے بعد شیشے کی الماری میں جا بیٹھتا، جیسے کوئی شاعر مشاعرہ پڑھ کر خلوت میں لوٹ آئے۔

ایک شام، جب میں اپنی معمول کی جگہ پر رکھا جا رہا تھا، آیا کی انگلی پھسل گئی۔میرا دستہ—وہ خوش خم دستہ جس پر انگلیاں شاعری کی مانند ٹھہرتی تھیں—ذرا سا ہل گیا۔ایک معمولی سی رگ پڑی، ایسی ہلکی کہ ظاہراً کچھ نہ بدلا، لیکن بیگم صاحبہ کی آنکھ جیسے خوردبین ہو۔اگلی صبح وہ چیخ اٹھیں:

"یہ کپ دیکھو! اس کا ہینڈل خراب ہو چکا ہے۔فوراً نکال دو۔صاحب کے سامنے شرمندگی ہوگی۔"

میری چمک بدستور موجود تھی، رنگت ویسی ہی، لیکن صرف وہ معمولی سا دراڑ، میری شناخت کے در پر دستک تھا۔

"یہاں، اس گھر میں، خوبصورتی سلامت ہو تو عزت ہے، ورنہ تمہیں خانے سے نکال کر کونے میں رکھ دیا جاتا ہے۔"

بیگم صاحبہ نے آیا سے کہا:

"اسے مالی کے حوالے کر دو۔وہی اس کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔"

یوں، میرا شیش محل سے کچی زمین کا رُخ ہوا۔لیکن جیسے ہی مالی نے مجھے تھاما، اس کی آنکھوں میں کچھ چمک سی آئی۔

اب میں ایک ٹوٹی چھت کے نیچے تھا۔میرا نیا گھر مٹی کے کچے دیواروں کا، شکستہ دروازوں کا، اور ننگے پیروں کی صحن کا گھر تھا۔یہاں چائے میں پتی کم، محبت زیادہ ہوتی تھی۔دودھ کے بجائے پانی، لیکن پیالہ تھامنے والی انگلیوں میں خلوص ایسا کہ شہد سے میٹھا۔

مالی ایک سادہ دل انسان تھا۔اس کا لباس پرانا، چہرہ جھلسا ہوا، لیکن مسکراہٹ میں ایک دیہاتی گیت کی طرح سچائی تھی۔

وہ مجھے دھودھو کر رکھتا، جیسے کسی شکستہ مقدس کتاب کو پونچھ رہا ہو۔

ان کے بچے، جو گلیوں میں ننگے پاؤں دوڑتے، شام کو مجھ سے کھیلنے کی کوشش کرتے، لیکن مالی انھیں ڈانٹ دیتا۔

یہ گھر غربت میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن ہر دیوار میں صبر کی مہک تھی۔ یہاں دراڑیں صرف برتنوں میں نہیں، دلوں میں بھی تھیں، مگر ان میں روشنی کی گنجائش باقی تھی۔ لوگ بےبس تھے، مگر ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ یہاں کوئی خریدار نہ تھا، سب عطا پر جیتے تھے۔ نہ قیمت، نہ بولی، صرف امید۔

اکثر مالی مجھے تھام کر کہتا:

"ہماری قسمت پتہ نہیں کب بدلے گی، لیکن اس کپ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ دن بدل جائیں گے۔

مگر میں جانتا تھا، دن بدلنے سے پہلے اکثر رات کی گھٹا اور گہری ہو جاتی ہے۔

میں کبھی کبھار سوچتا:

" کاش وہ اشرافیہ گھر جانتا کہ میں اب بھی محبت بانٹتا ہوں۔ میں اب بھی کام آتا ہوں۔ میں صرف ایک ٹوٹی ہوئی چیز نہیں ہوں۔ میں اُن خالی آنکھوں میں خواب بھرتا ہوں جو سوتے ہوئے بھی جاگتی ہیں۔"

یہ وہ مرحلہ تھا جب میرا جسم شکستہ ہوا، مگر میری روح مکمل۔

"میں وہ ٹوٹا ہوا آئینہ تھا جس میں امید نے اپنا عکس دیکھا۔"

"میری زندگی میں پھر ایک موڑ آیا۔

گرمیوں کا آغاز تھا۔ آسمان نیلا تھا، لیکن سورج کی نگاہ میں ایک اجنبیت سی تھی۔ افسرِ عالی مقام کی فیملی چھٹیاں منانے کے لیے پہاڑوں کا رُخ کر رہی تھی۔ موسم، وقت، اور راستہ سب کچھ گردش میں تھا، لیکن میں — ایک کپ — ان سب کے بیچ خاموش مسافر تھا۔

مالی، جو اب گھر کا پرانا وفادار سمجھا جاتا تھا، سفر میں شامل کر لیا گیا۔ اس نے مجھے کپڑوں میں لپیٹ کر احتیاط سے بیگ میں رکھ لیا۔ اس کے لیے میں اب بھی "خاص" تھا — شاید اس لیے نہیں کہ میں خوبصورت تھا، بلکہ اس لیے کہ میں یاد کی مانند تھا — ایک لمس، ایک تسلی، ایک تسکین۔

راستہ بل کھاتا ہوا تھا، پہاڑ اونچے تھے، اور ہوائیں ہموار۔ دریاؤں کی گنگناہٹ، درختوں کی سرگوشیاں، اور پہاڑوں کی خاموشی، سب ایک الٰہی نغمہ سا معلوم ہو رہے تھے، جیسے کائنات خود کسی راوی کی آواز سن رہی ہو۔

پہاڑی مقام پر پہنچ کر خیمے لگائے گئے، کرسیاں کھولی گئیں، بچے دوڑے، عورتیں ہنسیں، اور ہوا نے اپنا دامن پھیلا دیا۔

اگلی صبح سورج قدرے دیر سے نکلا۔ مالی اپنے معمول کی سادگی سے اُٹھا، چائے بنائی، اور مجھ میں انڈیلی۔ میں اب بھی چائے سے لبریز تھا، لیکن اس بار میرے اندر چائے کے ساتھ وقت کی تلچھٹ بھی تیر رہی تھی۔

وہ پہاڑی ڈھلان جہاں وہ چہل قدمی کرتا تھا، وہی مقام تھا جہاں سے میرا ماضی کھودا گیا تھا— جہاں کدالیں چلی تھیں، مزدوروں کے پسینے گرے تھے، اور مٹی نے وجود کا خواب دیکھا تھا۔

مالی چائے پیتا ہوا جا رہا تھا، اور میں اس کے ہاتھ میں جھولتا تھا، جیسے کوئی پرانا خواب دوبارہ دہرایا جا رہا ہو۔ پھر...

اچانک...

اس کا پاؤں پھسلا۔

چند لمحے... بس چند ہی لمحے... اور میں فضا میں معلق ہو گیا۔ میرے اندر کی چائے بوند بوند فضاء میں بکھرنے لگی، اور میں نیچے، زمین کی طرف لوٹنے لگا۔

ٹھن---

ایک آخری آواز... جیسے بانسری کا آخری سر، جیسے اذان کے بعد کا سکوت، جیسے سانس کی آخری آمدورفت۔

میرا جسم چکنا چور ہو گیا۔ دستہ ایک طرف جا گرا، پیندہ دوسری طرف۔ مٹی، جس نے مجھے جنم دیا تھا، اب مجھے جذب کرنے لگی۔

"میں ٹوٹ چکا تھا، لیکن فنا نہ تھا۔ میں لوٹ چکا تھا، لیکن مٹا نہ تھا۔ میں واپس اپنی اصل میں تحلیل ہو رہا تھا، جیسے کوئی درویش آخر کار قبا اُتار کر خاک ہو جائے۔"

مالی کے ہونٹوں پر ایک آہ آئی، لیکن وہ خاموش رہا۔ اس نے جھک کر میرے ٹکڑے سمیٹے، ان کو ہاتھ میں لیا، اور لمبی سانس لے کر کہا:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

پھر اس نے میرے کچھ ٹکڑے وہاں کی مٹی میں دبا دیے، باقی جیب میں ڈال لیے۔ شاید وہ اُنہیں بطور یادگار رکھے گا— شاید وہ انہیں خواب کے ٹوٹے ہوئے شیشے سمجھے گا۔

میں اب خاک ہوں... لیکن ایسی خاک جو جانتی ہے کہ وہ کیا تھی۔ میں چائے کا کپ تھا— ایک مکمل زندگی، ایک مکمل

زوال، ایک مکمل محبت۔

اور اب... میں مٹی ہوں۔

اور مٹی... کبھی نہیں مٹی، نہ مٹے گی، باقی سب مٹی میں مٹ جائے گا۔

کرسی کی آپ بیتی

میں ایک ٹوٹی پھوٹی، خستہ حال کرسی ہوں... دھوپ، گرد اور اداسیوں کے بستر پر پڑی، زندگی کے باقی ماندہ لمحے گن رہی ہوں۔ میرے آس پاس الماریوں کے شکستہ دروازے، کھلونے جواب ہنستے نہیں، اور ایک آئینہ ہے، جواب کسی چہرے کو عکس نہیں دیتا۔ یہ ایک ردّی کا گوشہ ہے، جہاں ماضی کی جھلکیاں گرد میں گم ہو چکی ہیں اور وقت اپنی وفا کو ٹھکرا چکا ہے۔

یہاں پڑی ہر چیز اپنی داستانِ غم سناتی ہے۔ ایک پرانی سائیکل کا اگلا پہیہ کٹا ہوا ہے، جیسے کسی سپاہی کا بازو۔ وہ کہتی ہے: "ایک زمانہ تھا، جب بچے میری زین پر بیٹھ کر گلیوں میں قہقہے بکھیرتے تھے۔" ایک آلہ ساز کی پتلی سی ڈبیا کہتی ہے: " کبھی میرے اندر ساز بجتے تھے، راگ بہتے تھے، اب صرف خامشی کا راگ رہ گیا ہے۔"

میرے بازو، جو کسی وقت کے وقار کی علامت تھے، اب کچے بانس کی مانند لرزتے ہیں۔ میری پشت، جو کسی وقت علم و عدل کا بوجھ اٹھاتی تھی، اب جھک چکی ہے۔ میری سانسوں میں بوسیدہ لکڑی کی سسکیاں گونجتی ہیں، اور میرے وجود پر وقت کے ناخنوں کے نشان کندہ ہیں۔

میں اس قبرستان میں پڑی سوچتی ہوں: کیا یہ وہی دنیا ہے جس کے لئے میں نے اپنی لکڑی کا غرور قربان کیا؟ کیا یہی لوگ ہیں جن کے لئے میں نے موسموں کے طوفان جھیلے؟ وقت، جس نے میرے وجود کو چمکایا، آج مجھ سے نگاہ چرا رہا

ہے۔انسان، جنہوں نے مجھ پر بیٹھ کر حکم چلائے، اب میری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

میں جانتی ہوں، میرا اختتام قریب ہے۔شاید کل کوئی آ کر مجھے کاٹ کر جلانے کی لکڑی بنا دے، یا پھر کسی بھٹی میں جھونک دے۔لیکن میں مٹی میں مل کر بھی اپنی کہانی کو ہوا کے کانوں میں سنا دوں گی، شاید کوئی سن لے، شاید کوئی سمجھے۔ اے ہواؤ! اگر تمہیں کبھی میرے جھونکوں کی خوشبو یاد آ جائے، تو میرے حصے کی وفا کسی نئی کرسی کو بخش دینا... تاکہ وہ میرے انجام سے سیکھے کہ دنیا میں ہر چیز کا ایک موسم ہوتا ہے، اور ہر موسم کا ایک انجام۔

میں ہمیشہ سے کرسی نہیں تھی۔میں ایک درخت تھا— شیشم کا مضبوط، سرسبز و شاداب درخت۔فطرت کی گود میں پلا بڑھا۔دھوپ میرے پتے چومتی، بارشیں میرے تنے کو دھوتیں، اور پرندے میرے بازوؤں پر گھونسلے بناتے۔ ہر موسم میرے دل میں نئی نغمگیاں بکھیرتا تھا۔بہار آتی تو میرے اندر ایک موسیقی جاگ اٹھتی، جیسے کوئی سونا ہوا فنکار ساز چھیڑ دے۔

میری جڑیں زمین کی گہرائیوں میں اترتی تھیں— جیسے میں دھرتی کی یادوں کو محفوظ کر رہا ہوں۔اور میری شاخیں آسمان کو چھونے کی خواہاں تھیں— جیسے میں بلندیوں سے لپٹنا چاہتا ہوں۔میرے سائے میں کسان آرام کرتے، چرواہے بانسری بجاتے، اور بچے کھیلتے تھے۔میں صرف ایک درخت نہیں تھا، ایک چھاؤں تھا، ایک ہمراز، ایک گواہ۔ میں نے کئی انسانوں کو دیکھا۔محبتیں، دھوکے، وعدے، گیت، جدائیاں۔میں ہر منظر کا خاموش حصہ تھا۔نہ کسی کو روکا، نہ کسی پر حکم لگایا، مگر ہر احساس میری چھال میں محفوظ ہوتا گیا۔

پھر ایک دن، صبح سویرے، دھند میں لپٹا ایک آدمی کلہاڑا لے کے آیا۔وہ تنہا تھا، مگر اس کے ہاتھوں میں بے رحمی کی دھار تھی۔اُس نے بغیر پوچھے، بغیر سنے، مجھ پر پہلا وار کیا۔وہ کلہاڑا نہیں تھا، جیسے کسی نے میرے خوابوں پر ضرب لگائی ہو۔

پہلی چوٹ پر میرے اندر ایک چیخ اٹھی۔کوئی سن نہ سکا، پرندے اڑ گئے، چیونٹیاں بھاگ گئیں، اور ہوا ساکت ہو گئی۔ ہر وار کے ساتھ میرے اندر کی روشنی بجھتی گئی، اور میں، جو برسوں سے زندگی بانٹتا رہا، خاموشی سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ جب مجھے کاٹا گیا، میرے تنے کے حلق سے رس بہا، جیسے کسی نے میری رُوح کو نچوڑا ہو۔پھر مجھے رسیوں میں باندھ کر بیل گاڑی پر رکھ دیا گیا۔وہ جنگل، وہ گھاس، وہ پرندے— سب پیچھے رہ گئے۔میں اب لکڑی تھا... بے جان، بے اختیار، ایک تجارتی مال۔

کچھ دنوں بعد مجھے ایک مستری کے ہنرمند ہاتھوں میں دیا گیا۔ اُس نے بڑی مہارت سے مجھے چیر کر، رندہ لگا کر، ہتھوڑیوں سے میری ہڈیوں کو تراشا۔ میں چیخنا چاہتا تھا، مگر اب آواز نہ تھی۔ میرا ہر ریشہ جیسے پوچھتا تھا: "یہی انجام تھا میرے سبز خوابوں کا؟"

جب میری شکل ایک کرسی میں ڈھل گئی، تب پہلی بار مجھے آئینہ ملا۔ میں نے اپنے آپ کو دیکھا—ایک نئی پہچان، مگر بے اصل۔ میرے اندر وہ درخت اب بھی رو رہا تھا۔ مگر وقت نے مجھے سکھا دیا کہ جب قسمت خود کو بدل دے، تو رونا بیکار ہوتا ہے۔

مستری کے ہاتھوں تراشے جانے کے بعد، میری پہلی منزل ایک عدالت بنی۔ وہ ایک چھوٹا سا دیہی کچہری نما کمرہ تھا، مگر وہاں جو کچھ ہوتا، وہ بسا اوقات پوری زندگی بدل دیتا تھا۔ میں اب ایک "کرسی" نہیں رہی تھی—میں "منصف کی نشست" بن گئی تھی۔ انصاف کی علامت، اختیار کا نشان، اور خوف کا منبع۔

مجھے عدالت کے کمرے کے بیچوں بیچ اونچے سٹیج پر رکھا گیا۔ میرے پیچھے دیوار پر ایک آیت لکھی تھی:

"وَ?ذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالعَدلِ"

جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو انصاف سے کرو

یہ آیت میری پشت پر ایسے پڑھی جاتی جیسے میری رگوں میں عدل کی لکیر کھینچی جا رہی ہو۔

میری گود میں وہ جج بیٹھتا جس کا ایک لفظ، ایک حکم، ایک جنبشِ قلم انسان کی تقدیر کا فیصلہ کرتا۔ میں اس کے نیچے جھکنے والے، اس سے رحم مانگنے والے، اور اس کے فیصلوں پر رو دینے والے لوگوں کو دیکھتی رہی۔ میں نے آنکھیں نہیں بند کیں، مگر کبھی زبان نہیں کھولی۔

میں نے دیکھا کہ کس طرح ایک ماں اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے نذر مانتی ہے، ایک باپ اپنی بیٹی کی عصمت کے لیے انصاف کا سوال کرتا ہے، اور ایک بے گناہ ملزم آنکھوں میں نمی لیے کہتا ہے: "حضور! میں نے کچھ نہیں کیا۔" اور جج—وہ کبھی خاموش، کبھی سخت، کبھی نرمی سے، مگر ہمیشہ مجھ پر بیٹھ کر، قانون کی کتاب کھولتا، دل نہیں۔

ایک بار ایک مقدمہ آیا، ایک کسان پر زمین پر ناجائز قبضے کا الزام تھا۔ وہ دھوتی پہنے، پاؤں ننگے، کانپتے ہونٹوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُس نے کہا:

"جناب! یہ زمین میرے باپ کی ہے... میرے باپ کے باپ کی"...

مگر سامنے بیٹھا سرمایہ دار زر و زور سے کاغذات دکھا رہا تھا۔ جج نے کاغذات کو قانون مانا، آنکھوں کی نمی کو نہیں۔
جب فیصلہ لکھا گیا، تو کسان زمین سے بھی گیا، زبان سے بھی گیا۔ وہ کمرہ عدالت چھوڑتے ہوئے پیچھے مُڑا، میری طرف دیکھا— شاید وہ جانتا تھا کہ سچ کی گواہی صرف میں نے دی ہے۔ میں وہ کرسی تھی جو سچ دیکھ سکتی تھی، مگر بول نہیں سکتی تھی۔
میری زندگی کا وہ دور سب سے بوجھل تھا۔ ہر دن مجھ پر انصاف اور ناانصافی کا بوجھ بڑھتا جاتا۔ میرے بازو نہ تھے، مگر میری پشت پر صدیوں کے فیصلے رکھ دیے گئے تھے۔ میرے تکیے میں کوئی پھول نہیں، صرف قانون کے خشک صفحات رکھے گئے تھے۔
کبھی کبھی رات کو، جب عدالت بند ہوتی، کمرہ سناٹے میں ڈوب جاتا، تب میں اپنے اندر سرگوشیاں سنتی— گواہوں کی جھوٹی قسمیں، وکیلوں کی چالاکیاں، ججوں کی تھکن، ملزموں کی سسکیاں۔ ان سب آوازوں کا مرکز میں ہی تھی— وہ کرسی، جو خود کو شیشم کے درخت کی ٹھنڈی چھاؤں سمجھتی تھی، اب آہنی فیصلوں کا ستون بن گئی تھی۔
پھر وقت بدلا۔ جج ریٹائر ہوا، عدالت کے کمرے کی مرمت ہوئی۔ مجھے اتارا گیا، سائیڈ پر رکھا گیا۔ کچھ دنوں بعد کسی نے کہا:
"یہ کرسی تو پرانی ہو گئی ہے، سکول میں دے دو۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے کمرے کے لائق ہے۔"
یوں مجھے ایک نئی دنیا میں دھکیل دیا گیا—
عدالت سے نکال کر جب مجھے سکول لایا گیا، تو میں تھکی ہوئی تھی۔ میرے پائے کچھ چرچرا رہے تھے، پشت پر عدالتی فیصلوں کا بوجھ تھا، اور سیٹ پر وقت کی گرد بیٹھی تھی۔ مگر جب ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے پہلی بار دیکھا، تو ان کی آنکھوں میں مجھے کوئی حقیر لکڑی کا ٹکڑا نہیں، بلکہ ایک قابلِ احترام ساتھی محسوس ہوا۔
انہوں نے مجھے ہاتھوں سے صاف کیا، میرے کناروں پر پالش کی، اور اپنے کمرے کے بالکل وسط میں میرے لیے جگہ بنائی— جہاں روشندان سے آنے والی روشنی سیدھی میرے تکیے پر پڑتی تھی۔ میں اب بھی "کرسی" تھی، مگر ایک نئی حیثیت کے ساتھ— علم کی خدمت گزار، تربیت کی گواہ، اور وقار کی امین۔
ہیڈ ماسٹر صاحب خود بھی غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے۔ درمیانے قد کے، گندمی رنگت، سفید شلوار قمیض اور کالی واسکٹ میں ملبوس، ہمیشہ ہاتھ میں قلم یا رجسٹر۔ ان کی آنکھوں میں ضبط، زبان میں شائستگی، اور چال میں وقار ہوتا۔ ان

کے دفتر میں داخل ہونے والا ہر طالبعلم آہستہ بولتا، اور ہر استاد اپنی آواز میں احترام سمولیتا۔

میں نے دیکھا کہ وہ مجھ پر بیٹھ کر سکول کے بچوں کے نتائج بناتے، استادوں کی حاضریاں چیک کرتے، سالانہ تقریبات کی منصوبہ بندی کرتے۔ وہ جب بھی میری پشت سے ٹیک لگا کر گہری سوچ میں ڈوبتے، کمرے میں سنّاٹا چھا جاتا۔ ان کے ہر فیصلے میں تجربے کی روشنی اور نیت کی خلوص شامل ہوتی۔

کبھی کبھار، جب کوئی بچہ شرارت کر بیٹھتا، تو وہ اسے میرے سامنے بٹھاتے۔ نہ مارتے، نہ ڈانٹتے، بس آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے:

"بیٹا، تم اپنے ماں باپ کی امید ہو۔ کیا تم چاہو گے کہ وہ شرمندہ ہوں؟"

اور میں، میں ہر بار گواہ بنتی اس نرم مگر مؤثر نصیحت کی، جو ایک استاد کے دل سے نکل کر طالبعلم کے ضمیر میں جا اُترتی۔

ہیڈ ماسٹر کا یہ دفتر صرف انتظامی مرکز نہیں تھا، یہ ایک تربیتی محراب تھی۔ یہاں استادوں کی تربیت ہوتی، والدین کی رہنمائی، اور بچوں کی رہبری۔ میں نے ان کے فیصلوں میں عدل دیکھا، ان کی گفتگو میں علم، اور ان کے رویے میں دردمندی۔

کبھی کبھی، جب اسکول بند ہو جاتا، کمرہ خاموش ہو جاتا، تو وہ تنہا مجھ پر بیٹھ کر پرانے کاغذات نکالتے، اور پرانی یادوں میں کھو جاتے۔ میں ان کے دل کی دھڑکنوں کو اپنی لکڑی میں محسوس کرتی — وہ اپنی تنہائی میں شاید کسی کھوئے ہوئے طالبعلم کی فکر کرتے، یا کسی استاد کے دکھ کو یاد کرتے۔ کبھی ہلکی مسکراہٹ، کبھی آہستہ آہستہ آنکھوں میں نمی۔

وہ مجھے عزیز رکھتے تھے۔ اکثر خود میرے پیچ کس سے کھول کر چیک کرتے، کہ کہیں کوئی کیل ڈھیلی نہ ہوگئی ہو۔ میں ان کی شفقت کو اپنے ریشوں میں جذب کر لیتی تھی۔

وقت گزرتا گیا۔ بالوں میں سفیدی بڑھتی گئی۔ ایک دن صبح دفتر کھلا، تو خبر آئی:

"ہیڈ ماسٹر صاحب ریٹائر ہو گئے۔"

اس دن دفتر کچھ ویران سا لگ رہا تھا۔ میں اپنے دل میں عجیب سی خالی جگہ محسوس کر رہی تھی۔ نیا ہیڈ ماسٹر آیا، مگر وہ وہ بات کہاں! اُس نے مجھے پرانی کہہ کر بدلنے کی ٹھانی، اور یوں میں کمرے کے ایک کونے میں رکھ دی گئی۔

وہ دن میرے لیے تنہائی کا آغاز تھا، مگر دل مطمئن تھا کہ میں ایک ایسے استاد کی خدمت میں رہی، جس نے مجھے محض کرسی نہیں سمجھا، بلکہ ایک ساتھی مانا۔

ریٹائرمنٹ کے کچھ ماہ بعد، ایک دن ایک دراز میں پڑے پرانے کاغذ کی مانند مجھے بھی دفتر سے نکالا گیا۔ میں سمجھی اب میرا وقت تمام ہوا، شاید کسی لکڑی والے کو بیچ دی جاؤں گی۔ مگر نہیں، ایک پک اپ آئی اور میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر کے صحن میں پہنچادی گئی۔ میرا دل دھڑکا— کیا وہ مجھے اپنے ساتھ لائے ہیں؟ کیا اُن کی یادوں میں میری بھی کوئی جگہ باقی ہے؟

ان کا گھر بھی ان کی شخصیت کی مانند سادہ، صاف اور باوقار تھا۔ پرانی اینٹوں سے بنا ہوا، سامنے چھوٹا سا باغیچہ، جس میں چنبیلی اور موتیے کے پودے خوشبو بکھیرتے۔ مجھے دیوان خانے کے ایک کونے میں رکھ دیا گیا، جہاں دھوپ سیدھی آ کر میرے پشت پر بیٹھتی، اور شام کو جالی دار کھڑکیوں سے چاندنی اترتی۔

یہاں زندگی کا انداز کچھ اور تھا۔ اب میں کسی حکم کی گواہ نہ تھی، نہ ہی نصیحت یا فیصلے کی۔ اب میں خاموشی کی ساتھی تھی، تنہائی کی ہمراز، اور یادوں کی ناظر۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اکثر دوپہر کو مجھ پر بیٹھ کر اخبار پڑھتے، کبھی پرانی کاپیوں کو دیکھتے، کبھی خاموشی سے آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتے۔ اُن کے چہرے پر تھکن تھی، مگر آنکھوں میں ایک عجیب سی روشنی۔ جیسے وہ ماضی کے اوراق پلٹ رہے ہوں، اور میں ان اوراق کے بیچ رکھی ہوئی ایک تصویر ہوں۔

کبھی اُن کے پوتے پوتیاں میرے بازوؤں پر چڑھتے، جھولتے، ہنستے، اور وہ مسکرا کر کہتے:

"یہ کرسی صرف کرسی نہیں، میرے پورے کیریئر کی گواہ ہے۔"

اور بچے حیران ہو کر پوچھتے:

"دادا! کرسی بھی گواہ ہوتی ہے؟"

تو وہ خاموش ہو کر میری پشت پر ہاتھ پھیرتے، جیسے میرے اندر چھپی یادوں کو سہلا رہے ہوں۔

ایک بار ان کی بیگم نے شکایت کی:

"یہ پرانی کرسی کہاں تک رہے گی؟ نئی لے آئیں، یہ تو پرانی ہوگئی۔"

مگر وہ مسکرا کر بولے:

"اس میں وقت کی خوشبو ہے، فیصلہ سازی کی تھکن، اور بچوں کی کامیابیوں کی خوشی۔ نئی کرسی وہ سب کہاں سے لائے گی؟"

ان کے کمرے میں ایک چھوٹا سی الماری تھی، جس میں وہ پرانے اسناد، بچوں کے خطوط، اور شاگردوں کی تصویریں رکھتے تھے۔ وہ اکثر انہیں نکال کر میرے سامنے بیٹھتے، ایک ایک تصویر کو غور سے دیکھتے اور پھر ٹھنڈی سانس بھرتے۔ کبھی ان کے پرانے شاگرد ملنے آتے۔ وہ مجھ پر بیٹھ کر باتیں کرتے، اُن کے چہروں پر عقیدت ہوتی، اور میرے دل میں سرشاری۔ میں محسوس کرتی تھی کہ میں ایک ایسے انسان کی زندگی کا حصہ رہی، جس نے محض تعلیم نہیں دی، بلکہ کردار تراشے۔

گھر میں اکثر خاموشی چھائی رہتی۔ ان کی بیگم عبادت میں مشغول، بچے اپنے کاموں میں، اور وہ... وہ اکثر میرے ساتھ۔ وہ اب مجھ پر صرف جسم کا بوجھ نہیں رکھتے تھے، بلکہ ان کی تنہائی، ان کے خواب، ان کی خاموش یادیں بھی میری پشت سے ٹیک لگاتی تھیں۔

کبھی کبھی رات کو وہ جاگتے، مجھے کھینچ کر برآمدے میں لے جاتے، اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولتے:

"پتا ہے کرسی؟ میں نے ساری عمر دوسروں کے لیے فیصلے کیے، مگر اپنے لیے کچھ طے نہ کر سکا۔"

میں خاموش رہتی۔ میں کرسی ہوں، بول نہیں سکتی، مگر سن تو سکتی ہوں۔ اور میں نے وہ سب سنا جو انہوں نے کسی سے نہ کہا۔

وقت گزرتا گیا۔ ان کے بال مکمل سفید ہو گئے۔ آواز مدھم ہو گئی، اور ایک دن... وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔ میرے بازوؤں میں ان کی آخری سانسوں کی تھرتھراہٹ ابھی بھی باقی ہے۔

اب میں اس گھر کے ایک کونے میں پڑی ہوں۔ کوئی مجھ پر نہیں بیٹھتا، نہ کوئی مجھ سے بات کرتا ہے۔ مگر میں جانتی ہوں، اس گھر کی فضا میں، دیواروں میں، اس صحن کی دھوپ میں میری لکڑی کی خوشبو بسی ہے — اور میں اب بھی خاموشی سے ان لمحات کی حفاظت کر رہی ہوں، جن میں ایک عظیم انسان کی تنہائی، محبت، اور قربانی چھپی ہے۔

اب وہ دن آ چکا تھا جس سے میں ہمیشہ خوفزدہ رہی — وہ دن جب میں کمرے کے کونے سے اُٹھا لی گئی، بغیر کسی احترام، بغیر کسی لمس کی نرمی کے، جیسے میں اب بیکار ہو چکی ہوں۔

ہیڈ ماسٹر صاحب کو دنیا سے رخصت ہوئے کئی مہینے بیت چکے تھے۔ اُن کے جانے کے بعد مجھ پر کسی نے بیٹھنے کی زحمت نہ کی۔ اُن کے بیٹے نے ایک دن فیصلہ کیا کہ گھر کی صفائی ہونی چاہیے۔ الماریوں سے پرانی کتابیں، میز سے زنگ آلود لیمپ، اور مجھے — اس پرانی، خراشوں سے بھری، یادوں سے لبریز کرسی کو — کباڑ خانے بھیج دیا گیا۔

کباڑ خانے کا منظر دفتر اور گھر سے بالکل مختلف تھا۔ یہاں شور تھا، بے ترتیبی تھی، اور ایک وحشت سی طاری رہتی تھی۔ لوہے کے ٹکڑے، ٹوٹے ہوئے پنکھے، شکستہ آئینے، بیجان کھلونے، پرانے ریڈیو، سب ایک دوسرے سے بے نیاز پڑے تھے۔

مجھے دکان کے باہر، دھوپ اور گرد کے درمیان ایک کونے میں ڈال دیا گیا۔ اب نہ کوئی مجھ پر بیٹھتا تھا، نہ کوئی میری طرف دیکھتا۔ میرا رنگ ماند پڑنے لگا، میری لکڑی میں دراڑیں آنے لگیں، اور میرے بازوؤں کی مضبوطی کمزور ہونے لگی۔

کبھی کبھی کوئی گاہک آتا، میری طرف دیکھتا، انگلی سے تھوڑا سا زور دیتا، اور پھر نفی میں سر ہلا کر آگے بڑھ جاتا۔

"بہت پرانی ہے، جوڑ بھی کمزور لگ رہے ہیں۔"

ایک دکاندار نے دوسرے سے کہا:

"جلانے کے کام آ جائے گی، یا پھر کسی بڑھئی کو دے دینا، شاید کوئی پرزہ کام آ جائے۔"

میرے دل میں ایک ہوک سی اٹھی— کیا یہی میرا انجام ہوگا؟ جس کرسی پر علم کے فیصلے ہوتے تھے، جس پر ایک ہیڈ ماسٹر کی عظمت بیٹھتی تھی، جس پر بچوں کی کامیابیوں کے خواب سنوارے جاتے تھے، وہ اب لکڑی کے کوئلوں میں جل کر راکھ ہو جائے گی؟

میں خود سے مخاطب ہوئی:

"او کرسی! تُو نے وقت کو سہا، شخصیات کا بوجھ اٹھایا، خامشی میں فیصلوں کے گواہ بنی، اور اب تیرے لیے کوئی لفظ بھی باقی نہیں؟"

پھر مجھے اس کباڑ خانے میں پھینک دیا گیا جہاں میں آپ کو اپنی داستان سنا رہی ہوں۔

برگد کے درخت کی آپ بیتی

(پیدائش سنہ ۲۰۱۱ء)

میں برگد کا درخت ہوں...

ہاں میں وہی برگد ہوں جو صدیوں سے دھرتی کے سینے میں اپنی جڑوں کا جال بچھائے بیٹھا ہے، جس کے سائے میں تاریخ نے کئی بار سانس لی ہے۔

آج میری شاخیں بے جان بازوؤں کی مانند نیچے لٹک رہی ہیں، جیسے کوئی تھکا ہارا مجذوب سالکوں کی صدائیں سن کر آخر کار خاموش ہو گیا ہو۔ میری چھال، جو کبھی آبِ حیات کی ضامن تھی اب خزاں رسیدہ کفن کی مانند بدن سے لپٹی ہے۔ میرے پتّے، جو کبھی سورج کی روشنی سے آنکھ ملاتے تھے اب مٹی کی طرف جھکتے ہیں، گویا زمین کے کان میں آخری وصیت کہہ رہے ہوں۔ میری جڑیں، جن میں کبھی زمینی سچائیوں کا خمیر دوڑتا تھا، اب جیسے تھک ہار کر گہرائیوں میں خود کو دفن کر چکی ہوں۔

ایک وقت تھا کہ میں وقت کی سانسوں کا امین تھا، اب خود وقت مجھ سے دُور ہوتا جا رہا ہے۔ میرے سائے میں کبھی قافلے رکتے تھے، درویش مراقبے میں گم ہوتے، اور بچے میرے دامن میں خواب بُنتے تھے۔ آج وہی سایہ شکستہ قبروں کی مانند ویران ہے، جیسے صدیوں کی تھکن نے اسے بانجھ کر دیا ہو۔ ہوا جب میری شاخوں سے ٹکراتی ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ مجھ سے آخری سلام کہہ رہی ہو، اور میں، ایک صوفی کی مانند،

خاموشی سے ہر جھونکے کو الوداع کہتا ہوں۔ وقت کی گرد میرے تن پر ایسے جم گئی ہے، جیسے کسی پرانی کتاب کا آخری باب، جسے کوئی پڑھنے والا باقی نہ ہو۔

میں محض ایک درخت نہیں ایک صدیوں پر محیط داستان ہوں جو اب اپنے انجام کی طرف سرک رہی ہے۔ میرا ہر خمیدہ عضو ایک خواب ہے جو مرنے سے پہلے جاگ گیا ہے۔ میں ایک سایہ ہوں جو سورج سے منہ موڑ کر فنا کی سمت بڑھ رہا ہے۔

میں آپ کو اپنی داستان حیات سنانا چاہتا ہوں۔ میری زندگی آپ کے لحاظ بہت طویل ہے لیکن میرے لیے جیسے چند دن گذرے ہوں۔ میرا ایک ایک دن آپ کی ایک ایک صدی کے برابر ہے۔ میری داستان ایک تاریخ ہے، ایک سبق ہے، ایک عبرت ہے۔

تو سنئے!

میں برگد ہوں... وہی جو تمہیں گاؤں کے وسط میں خاموشی سے کھڑا دکھائی دیتا ہے، جس کی جڑیں زمین کی آنتوں میں اترتی جاتی ہیں اور شاخیں آسمان کی وریدوں کو چھوتی ہیں۔ **مگر** تم نہیں جانتے کہ میرے اندر صدیوں کی دھول چھپی ہے، میرے تن پر وقت نے ہزار ہاتھیوں کے پاؤں رکھے ہیں، اور میرے پاتوں میں وہ سانسیں گونجتی ہیں جو صدیاں پہلے بکھر چکی ہیں۔

میں نے پہلا سانس اس وقت لیا جب ہوا میں اذان کی پہلی صدا گونجی تھی۔ سورج ابھی مشرق سے جھانکتا تھا، اور زمین پر تلواروں کی نوکیں روشنی کے عکس کو کاٹ رہی تھیں۔ ترک گھوڑوں کی گرد میرے نئے پتے جھاڑتی رہی۔ میرا تن ابھی کمزور تھا، **مگر** میں نے ان فاتحوں کے سائے میں پرورش پائی۔

وہ ترک جو تاتاری چہرے لیے فارسی بولتے تھے، میرے پاس بیٹھتے، مجھے پانی دیتے، میرے قریب آگ جلاتے اور قرآن کی آیات دھیمی آوازوں میں پڑھتے۔ وہ دن تھے جب ایمان کی خوشبو بارود کی مہک سے ملی جلی تھی۔ زمین کا ہر ذرہ ایک نئے مذہب کے زیرِ اثر آچکا تھا۔

میرے سائے میں اکثر دو چہرے بیٹھا کرتے:

ایک پرانی دیوی کے پجاری، جو لکڑی کی مورتیوں کو چھپا کر لاتے اور پتے میرے قدموں میں رکھ کر منّت مانگتے، اور دوسرے وہ نو آموز مومن جو حجرہ بناتے، وضو کرتے، اور میری جڑوں پر پانی گراتے۔ میں کسی کا نہیں تھا، مگر سب

میرے تھے۔زبانیں بھی میرے نیچے بدلتی رہیں۔کبھی کوئی دِراوڑی بولی بولتا،کبھی سنسکرت کی ٹوٹی پھوٹی رمق سنائی دیتی،پھر فارسی کی چادر دھیرے دھیرے سب کچھ ڈھانپنے لگی۔

میں نے یہ الفاظ پہلی بار سنے:

"دل"،"نور"،"شوق"،"فنا"،"جلوہ"،"دید"۔اوران الفاظ کے ساتھ ہی محبت ایک مذہب بن گئی۔میرے نیچے پہلا جھگڑا بھی ہوا،پہلا نکاح بھی۔پہلی بار ایک عورت نے بیٹے کی خواہش میں میرے ہی سائے تلے چراغ جلایا،اور ایک درویش نے روزے کی افطاری کی دعا یہیں پر مانگی۔

میں نے جانا کہ میں فقط درخت نہیں،ایک دروازہ ہوں ان دنیاؤں کے بیچ جو بظاہر الگ،مگر اصل میں ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔

ایک طرف آریہ ورت کی پکار تھی،دوسری طرف خراسان کی سرگوشی۔اوران دونوں کے بیچ میں،میں... برگد،اپنی خامشی کے اندر دونوں کو جذب کیے،دونوں کا امین۔یہ صدی میرے لیے جڑیں گاڑنے کی صدی تھی۔نہ صرف زمین میں،بلکہ اس تہذیب میں جس کا پہلا ورق خون،اذان،اور آرزو سے رنگا ہوا تھا۔

میرا ایک دن ہوا،شام ہوئی،رات ہوئی،اگلا دن آ گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب زمین کے زخموں سے درویشوں کے چشمے پھوٹنے لگے۔ترکوں کے سنبھالے ہوئے گھوڑے تھک چکے تھے،اور اب صوفیوں کے ننگے پاؤں زمین کو چومتے تھے۔میرے سائے میں ایک نئی خوشبو رچنے لگی—چادر والے قلندر،خاموش فقیر،رباب بجانے والے مسافر میرے نیچے جمع ہونے لگے۔ان کے ہاتھوں میں نہ تلواریں تھیں نہ زبانوں پہ منطق،صرف عشق کے چراغ تھے،جن سے میرے پتے تک روشن ہونے لگے۔انہوں نے نہ مجھ سے مذہب پوچھا نہ نسل،بس آ کر بیٹھ گئے— کبھی مراقبہ میں،کبھی وجد میں،کبھی خامشی میں۔وہ بولتے نہیں تھے،مگر سب کہہ دیتے تھے۔

میں نے پہلی بار لفظ"وحدت"سنا،اور جانا کہ جس مٹی پر میں کھڑا ہوں،وہ صرف زمین نہیں—ایک خواب ہے۔وہ خواب جس میں نہ ہندو تھا نہ مسلمان،صرف انسان تھا،جو میرے تنے سے لپٹ کر اپنے آنسو بہاتا،اور میں اس کے آنسو چوس کر آسمان کی طرف منہ کرتا،کہ شاید خدا بھی اسے دیکھے۔اس دور میں میرے نیچے ایک چھوٹا سا مکتب قائم

ہوا۔ایک بزرگ، جنہیں سب "بابا جی" کہتے تھے، درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بچوں کو کہانیاں سناتے۔کہانیاں... جو کسی کتاب میں نہ تھیں، مگر دلوں میں تھیں، روحوں میں اترتی تھیں، اور ایک خاموش انقلاب کو جنم دیتی تھیں۔

زبان بھی بدلنے لگی۔پہلی بار میں نے "پنجابی" سنی — نہ سنسکرت جیسی پہیلی، نہ فارسی جیسا عکس۔یہ تو مٹی کی آواز تھی، ماں کی گود جیسی، نرم اور گہری۔ایک لڑکی، جسے سب "نوراں" کہتے تھے، میرے نیچے گیت گاتی اور اُس کی آواز میں میں نے پہلی بار محبت کو سانس لیتے سنا۔عشق، جو نہ عقیدہ تھا نہ منطق — بس کیفیت۔لوگ میرے سائے میں بیعت کرنے لگے۔کسی نے منت مانی، کسی نے روزہ رکھا، کسی نے میری چھاؤں میں بیٹھ کر محبوب کا خط پڑھا، اور کسی نے خواب دیکھا کہ وہ اڑ رہا ہے — اور میں وہی خواب ہوں۔یہ صدی میری روح میں صوفی کی طرح اتر گئی۔میری جڑیں نہ صرف زمین میں، بلکہ دلوں میں پیوست ہونے لگیں۔میں فقط سایہ نہ رہا — میں راز بن گیا، رمز بن گیا، اور صوفی کی زبان پر حرفِ آخر۔

میرا دوسرا دن ہوا، شام ہوئی، رات ہوئی، اگلا دن آ گیا۔

میرے گرد فضا میں شور بڑھنے لگا — گھوڑوں کی ٹاپیں، نیزوں کی چمک، قلعوں کی منادی اور لہو کی بو جو مٹی میں اتر گئی۔سلطنت دہلی کی بازگشت یہاں تک پہنچی۔مگر میں ابھی بھی وہی برگد تھا جو رات کی خامشی میں روحوں کی سرگوشی سنتا اور دن کے اجالے میں مسافروں کو سایہ دیتا۔

ایک دن، میں نے دیکھا کہ میرے نیچے بیٹھنے والے چہرے بدل گئے ہیں۔وہ جو کل تک رباب بجاتے تھے اب تخت و تاج کے تذکرے کرتے ہیں۔وہ جو عشق کی بات کرتے تھے اب فتح کی بات کرتے ہیں۔میں خاموش رہا — کیونکہ برگد بولتا نہیں، صرف دیکھتا ہے اور وقت کی کروٹ کو یاد رکھتا ہے۔

اب میرے نیچے بھی کچھ بدلا — ایک مکتب کی جگہ "دارالقضا" بن گیا۔فقیہ بیٹھتے، مقدمے سناتے، فتویٰ صادر ہوتا اور میں حیرت سے دیکھتا کہ انصاف کا دروازہ کھلا ہے... مگر دروازے کی دہلیز پر صرف طاقتور بیٹھا ہے۔پہلی بار میرے تنے پر خون کے چھینٹے پڑے۔کسی غلام کی چیخ نے میرے پتوں کو ہلا دیا اور میں لرز گیا — کہ شاید سایہ اب صرف دھوپ کا دشمن ہے انسان کا نہیں۔صوفی ابھی باقی تھے مگر ان کے گرد خول چڑھ گیا تھا۔خانقاہیں بن گئیں مگر دلوں سے

سادگی جاتی رہی۔ محبت ابھی باقی تھی، مگر اس میں رسم شامل ہو گئی۔

پنجابی زبان مزید پھیلنے لگی — مگر اب اس میں دعا کم، فخر زیادہ تھا۔ شاعری نے جگہ پائی، مگر اس میں انا کا عکس تھا۔ میں نے دیکھا، ایک فقیر جو مجھ سے لپٹ کر رویا کرتا تھا اب محل میں بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ میں نہ رویا، نہ بولا، مگر میرے پتے خزاں میں وقت سے پہلے جھڑنے لگے۔ یہ صدی میرے لیے جنگ اور جبر کی صدی تھی مگر صوفی کا چراغ ابھی جل رہا تھا — بس روشنی مدھم تھی۔

میرا تیسرا دن ہوا، شام ہوئی، رات ہوئی، اگلا دن آ گیا۔

میں نے زندگی کے اوراق کو لرزتے دیکھا اور ہر پتا جو میری شاخ سے گرا اس میں ایک نام لکھا تھا — کبھی سلطان، کبھی فقیر، کبھی شاعر، اور کبھی ایک بیکار خاموشی۔ اس دن کی صبح میرے لیے کچھ نرم تھی۔ پہلی بار میری چھاؤں میں ایک نحیف الجثہ ننگے پاؤں، گرد آلود لباس میں لپٹا ہوا نوجوان آیا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی عصا نہ تھا مگر اس کی آنکھوں میں ایک عالم سمایا تھا۔ وہ بیٹھا، چپ چاپ۔ پھر کچھ پڑھنے لگا... پہلے ہلکی آواز، پھر جیسے ہوا کے ساتھ مل کر اس کی آواز فضا میں گھل گئی۔

"محبت دا سچ، جتھے بولی نہ ہوئے،

اوتھے صوفی وی چپ، تے شیخ وی ہارے"

(جہاں سچ اور محبت نہ ہو وہاں صوفی اور شیخ دونوں شکست کھا جاتے ہیں)

میں لرز گیا... یہ آواز محض انسان کی نہ تھی — یہ وہ نغمہ تھا جو صدیوں کے دل سے نکلتا ہے۔ اس صوفی شاعر کا نام وقت کی کتاب میں کہیں گم ہے مگر اس کی سانسیں میری چھال میں محفوظ ہیں۔ اس نے کئی دن میری چھاؤں میں بسر کیے۔ کبھی وہ مجھ سے سوال کرتا:

"برگد، تُوں وی بول سکدا ایں؟"

(اے برگد، تم بھی بول سکتے ہو؟)

اور میں خاموش رہتا کہ میرے جوابات ہوا کے کان میں ہوتے ہیں۔ اسی دن میں پنجابی زبان نے نئی روح پائی۔ صوفی شعرا نے اسے مٹی میں بونا شروع کیا۔ الفاظ مہکتے گئے، اور لوک روایت میں ایک نئی خوشبو بسی۔ لوک کتھائیں گائی

جانے لگیں اور عورتیں رات کے وقت میرے نیچے گیت گاتیں۔

"ہیر رانجھا"، "سوہنی مہینوال" — محبت کی ان کہانیوں میں انقلاب کی رمق چھپی تھی۔ مگر شہر دور ہو چلے تھے۔ شاہی دربار میں فارسی بولی جاتی تھی۔ اور عدالتوں میں عربی جبکہ عوام کے لب پر پنجابی تھی اور دل میں بے بسی۔ میرے پتّے گواہ ہیں، یہ صدی تصادم کی صدی نہ تھی، بلکہ روحانی تجدید کی صدی تھی۔ مگر جہاں روشنی ہوتی ہے، وہاں سایہ گہرا ہو جاتا ہے۔ اسی صدی کے آخر میں شاہی گھوڑے ایک بار پھر میرے پہلو سے گزرے اور صوفی شاعر اچانک غائب ہو گیا۔ کہیں وہ قید ہوا؟ یا مزار میں سما گیا؟ میں نہیں جانتا — میں صرف ہوا کی لرزش سنتا ہوں جو آج بھی اس کی نظم دہراتی ہے:

"ساہ وی اللہ دا، تے درد وی اللہ دا، ساہ نکلے تے کی رہندا اے؟"

(سانس بھی اللہ کی اور درد بھی اللہ کا سانس چلی جائے تو کیا باقی رہتا ہے؟)

میرا چوتھا دن ہوا، شام ہوئی، رات ہوئی، اگلا دن آ گیا۔

میری جڑیں زمین میں بہت نیچے تک اتر گئی تھیں... اور میری شاخیں آسمان کی شریانوں کو چھونے لگی تھیں، مگر میں جانتا تھا کہ جو اصل کشمکش ہے، وہ نہ نیچے ہے نہ اوپر — وہ انسان کے دل میں ہے۔ اس دن کا آغاز سناٹے سے ہوا، جیسے کسی مرثیے کا پہلا مصرع۔

فقیروں کی بانسری مدھم پڑنے لگی اور سرکاری نقیب کے ڈھول کی تھاپ بلند۔ نئی سلطنت نے پرانے پیروں کی قبروں پر اپنے جھنڈے گاڑ دیے۔ اب جو میری چھاؤں میں بیٹھتا تھا وہ یا تو کسی دربار کا سفیر ہوتا یا کسی سلطنت کا مفرور۔ میرے پتے ان کی سرگوشیوں سے بھرے ہوئے تھے:

"لودھی کی فوج آ چکی ہے"" ... ساہ (راکھ) کے بدلے تلوار کی دھار ملی ہے"" ... سادات کوچ کر رہے ہیں"...

میں نے لاہور کی فصیلوں پر نئے رنگ دیکھے۔ کبھی سنہرا، کبھی خاکی، کبھی خون آلود سرخ۔ مگر میرے لیے سب رنگ ایک جیسے تھے — کہ سب بہالے جاتے تھے انسان کی معصومیت کو۔

پنجاب کے قلب میں اس صدی کے وسط میں ایک اور انقلاب جنم لینے لگا۔ کہیں کسی نگر میں بابا نانک کی آواز ابھری۔ یہ آواز نہ صوفی کی تھی، نہ درویش کی — یہ ایک نئے سفر کی صدا تھی۔ میرے قریب بھی کوئی آیا تھا، جس نے ایک شب

میری چھاؤں میں بیٹھ کر کہا تھا:

"نہ کوئی ہندو، نہ کوئی مسلمان"...

میں چونک گیا۔ یہ کیسی زبان ہے جو تفریق کے تار کاٹتی ہے؟ یہ کون سا دریا ہے جو ایمان کو وحدت میں بہا لے جاتا ہے؟ میرے تنے پر اس نے اپنا ہاتھ رکھا۔ نہ دعا مانگی، نہ کچھ مانگا — بس رخصت ہو گیا۔ میں بہت دیر تک کانپتا رہا۔ جیسے میری چھال میں کوئی آگ بھڑک رہی ہو۔

اب کے بار لُٹیرا نہیں آیا بلکہ ایک نکتہ آشنا آیا تھا۔ مگر تخت پھر بھی نہیں بدلے۔ بادشاہ بدلے، سپہ سالار بدلے، مگر زبان وہی رہی:

فتح، زمین، خراج، اور خون۔

میرے نیچے بچے اب وہ کھیل نہیں کھیلتے تھے جو صدی پہلے کھیلتے تھے۔ اب ان کے ہاتھوں میں لکڑی کی تلواریں تھیں اور آنکھوں میں وہ خواب جو بادشاہوں نے بیچے تھے۔ ایک دن ایک سوار آیا اپنی تھکی ہوئی آنکھوں اور زخمی پاؤں کے ساتھ۔

کہنے لگا:

"یہ درخت بھی بوڑھا ہو گیا ہے جیسے ہمارا ضمیر"...

میں خاموش رہا۔ کہ شاید ہر ضمیر کی چھاؤں میں ایک برگد ہوتا ہے جو سب کچھ سنتا ہے مگر بولتا نہیں۔

میرا پانچواں دن ہوا، شام ہوئی، رات ہوئی، اگلا دن آ گیا۔

اس دن کا آغاز گھوڑوں کی ٹاپوں سے ہوا۔ زمین ہنوز تھرتھرا رہی تھی جب پہلے مغل گھوڑے نے یہاں کا رزق چکھا۔ اس دن علی الصبح ایک کارواں میرے نیچے رکا۔ لباس اجنبی، لہجہ تیز، آنکھوں میں رعب اور سروں پر دستاریں جو ستاروں سے باتیں کرتی تھیں۔ میں نے جانا یہ صرف حکمران نہیں یہ خوابوں کے سوداگر ہیں۔

بابر آیا، اس کے پیچھے ہما کا سایہ۔ کہتے تھے، وہ علم اور عدل کا پرچم لایا ہے۔ مگر میری جڑوں میں تو صرف تلواروں کی زنگار پہنچی۔ دھرتی نے اب نئی لہجے سنے — فارسی، ترکی، اور ایک خاص درباری اردو جو امراء کے ایوان میں جنم لے رہی تھی۔ میری چھاؤں میں اس صدی میں کئی نئی محفلیں سجیں۔ اکبر کے دور میں علماء، فلسفی، مصور، موسیقار یہاں آن

بیٹھے۔میں نے "دینِ الٰہی" پر مباحثے سنے جن میں مذہب کو صلحِ کل کی صورت میں پیش کیا گیا۔میری چھال پر قلم کشی ہوئی کسی نے گلابی روشنائی سے لکھا:

"اکبر بادشاہ نے صلح کا بیج بویا"...

اور پھر اگلے ہی دن کسی تیز چاقو سے کاٹ دیا گیا۔ان دنوں میرا سایہ صرف تھکن کا مرہم نہ تھا بلکہ ایک گوشہ تھا جہاں تھکے ہوئے دل اور الجھے ہوئے نظریے ایک دوسرے کو پناہ دیتے۔لوگ اب فارسی میں شعر کہتے، اردو میں بات کرتے، پنجابی میں گاتے، اور عربی میں دعا کرتے۔

صوفی شاعر یہاں کبھی کبھار آ کر کوئی نغمہ چھیڑتے:

"ساہب میرا اِکو ہے... ہور دوجا کوئی نائیں"...

(میرا ایک ہی مولا ہے، میں کسی دوسرے کو نہیں جانتا)

اور میں جانتا تھا کہ اس اِکو (ایک) کی پکار زمانوں کو چیرتی ہے۔

میرے نیچے بیٹھ کر کوئی لڑکا کتاب کے صفحے پلٹتا جس پر قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ فارسی اشعار بھی ہوتے:

"بنی آدم اعضائے یک دیگر اند"...

اور میں سوچتا کاش یہ برگد بھی آدم کے اعضا میں شامل ہوتا شاید درد بانٹنے کا ہنر آ جاتا۔

صدی کے آخر میں فضا میں ایک ہلکی سی گھبراہٹ در آئی۔شاہجہان کے قدموں کی چاپ سنائی دی اور دربار کی روشنیوں کا عکس بھی مجھ تک پہنچا مگر اس روشنی میں کچھ اندھیرے بھی چھپے ہوئے تھے۔اب فنِ تعمیر کا جادو طلسم بننے لگا تھا اور روحانی گفتگو رفتہ رفتہ مجسموں کے سائے میں کھو گئی تھی۔میں دیکھ رہا تھا کہ مغل عظمت کی سیڑھی چڑھ چکے تھے مگر نیچے زمین دراڑیں مارنے لگی تھی۔

میرا چھٹا دن ہوا، شام ہوئی، رات ہوئی، اگلا دن آ گیا۔

گزشتہ دنوں کی نسبت یہ دن دلوں پر زیادہ گراں گزرا۔میرے پتوں پر اوس کے قطرے اب شبنم کی مانند نہ رہے بلکہ خون آلود آنسو بن چکے تھے۔دن کا آغاز ہوا تو فضاؤں میں ایک پر شکوہ خامشی پھیلی ہوئی تھی۔یہ شاہجہان کا دور تھا جس نے سنگ مرمر سے محبت کو قید کیا اور محبت کے لیے مقبرہ بنا دیا۔

میں نے ان دنوں کئی قافلے دیکھے جو آگرہ اور لاہور کے بیچ راہگیر تھے۔ میرے نیچے رک کر پانی پیتے، سایہ لیتے، اور تاج محل کی کہانیاں سناتے۔ میں سوچتا، کیا محبت واقعی اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ اسے مقبرے میں دفن کیا جائے؟ مگر وہ محبت جو مرمر میں چمکتی تھی انسانوں کے دلوں سے رخصت ہونے لگی تھی۔ مغل فن عروج پر تھا، سنگتراش، معمار، خطاط، شاعر... سب کی محنت دیواروں پر نقش ہو رہی تھی مگر دلوں پر دراڑیں پڑ رہی تھیں۔

میرے نیچے اب وہ صوفی کم آتے جو حرفِ حق کی بات کرتے تھے۔ ان کی جگہ اب درباری فقیہ سیاسی عالم، اور مصلحت پسند واعظ آنے لگے۔

ان کے الفاظ خوشنما تھے مگر بے ذائقہ — جیسے پھول بغیر خوشبو کے۔

اورنگزیب کے قدم جب زمین پر پڑے تو درختوں نے اپنے سائے سمیٹ لیے۔ میں نے بھی اپنی شاخیں کچھ سکیڑ لیں کیوں کہ اب گفتگو شوق کی نہیں شریعت کی تفہیم کی تھی۔ اورنگزیب نے اگرچہ مذہب کو ریاست کا مرکز بنایا مگر سماج کی سانسیں تنگ ہونے لگیں۔ میرے نیچے وہ ساز جو کبھی بجتے تھے، بین، ستار، بانسری، اب خاموش ہو گئے تھے۔

اس دن میں میں نے کئی نئے چہروں کو پایا جن کی زبانوں پر عربی کے الفاظ تھے مگر دلوں میں کجی۔ میں نے کئی بار محسوس کیا کہ لفظ "حلال" زبان سے نکلتا ہے اور آنکھیں خون آلود "حرام" کی طرف اٹھتی ہیں۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے جڑوں میں ایک بیج پڑا ہے جو دھیرے دھیرے انگریز کا جھنڈا بننے والا ہے۔ ابھی وہ نہیں آیا مگر اس کی آہٹ، اس کی چال، میرے تن پر سرسرانے لگی تھی۔

دن کے آخر میں میرا وجود اک بوجھ سا محسوس کرنے لگا۔ لوگ اب سائے کو بھول چکے تھے وہ صرف حکمرانی، فقہی جنگوں، اور درباری سزاؤں کی بات کرتے تھے۔ میں خاموش رہا کیوں کہ اب لفظ زخم دینے لگے تھے۔

میرا ساتواں دن ہوا، شام ہوئی، رات ہوئی، اگلا دن آ گیا۔

پچھلے دن کے زخم ابھی مندمل نہ ہوئے تھے کہ اس دن گویا میری جڑوں پر نمک چھڑک دیا گیا۔ مغلیہ سلطنت کی بنیادیں اب ریت پر لکھی عبارت کی مانند تھیں۔ شاہی قلعوں میں گونجنے والے نعرے

مدھم ہو چکے تھے اور تخت کے گرداب تاج نہیں سازشیں ناچنے لگی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ بادشاہی مسجد کے مینار سجدوں کے بوجھ سے تھکنے لگے، اور مسجد کے صحن میں سیاسی جوتیوں کی چاپ بڑھ گئی۔ میرے نیچے بیٹھنے والے اب نغمہ سرا صوفی

نہیں بلکہ پناہ مانگتے درویش تھے جن کے ہاتھوں میں خالی پیالے اور آنکھوں میں لرزتے سوال تھے۔

شمال سے افغانوں کا غبار اٹھا اور نادر شاہ کے گھوڑے جب شہر لاہور میں داخل ہوئے تو میں نے پہلی بار اپنی چھاؤں میں خون کی بو محسوس کی۔ زیورات، کتابیں، اور عزتیں لوٹی گئیں، مگر سب سے بڑا نقصان وہ ہوا جب میرے نیچے بیٹھنے والے بزرگوں نے کہنا شروع کیا:

"اب وقت کے پاؤں میں بیڑیاں نہیں، خنجر ہیں۔"

پھر احمد شاہ ابدالی آیا، ایک اور تیز آندھی، جو جسم سے پہلے روح کو روندتی گئی۔ میرے پتے جھڑتے رہے اور زمین پر گرنے والا ہر پتہ اک خواب کی موت کا اعلان تھا۔ اس دن میں میں نے ایک اور اجنبی کو آتے دیکھا جس کی وردی سفید تھی آنکھوں میں چالاکی، اور لہجے میں نرمی کی آڑ میں حکم۔ جی ہاں... انگریز!

ابھی وہ حاکم نہیں بنا تھا مگر تاجر کے لباس میں میرے نیچے چائے پینے آتا۔ کبھی مقامی لڑکوں سے ان کی زبانیں سیکھتا اور کبھی میرے پتے نوچ کر "سائنس" کے نام پر تجربے کرتا۔

زبانوں میں بھی تبدیلی آچکی تھی — فارسی، جو کبھی شرفاء کی زبان تھی اب دبنے لگی۔ پنجابی، جو ماں کی طرح محبت کرتی تھی اب خود اپنے لہجے سے خجل ہونے لگی۔ لوگوں کی زبانوں پر اب اردو کے بجائے مایوسی کے فقروں نے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے نیچے کے گاؤں کا نمبردار اب شاہی خاندان کا وفادار نہیں بلکہ انگریز تاجر کا خوشامدی ہو گیا ہے۔ صوفی کی جگہ منشی بیٹھا کرتا، فقیر کی جگہ دلال، اور نیکی کی جگہ اب فائدہ بیٹھتا تھا۔ میرے تن پر گرتی دھوپ میں مجھے آنے والی صدی کی پیش گوئی سنائی دینے لگی: لوہے کی ریل، کوئلے کا دھواں،

اور عدل کی جگہ حساب۔ زوال کا یہ نوحہ میری ہر شاخ پر لکھا جا چکا تھا۔

میرا آٹھواں دن ہوا، شام ہوئی، رات ہوئی، اگلا دن آ گیا۔

یہ دن میرے لیے گویا اک ایسی شام تھی جس میں سورج تو تھا، مگر روشنی بیگانہ اور ہر سایہ خود اپنے وجود سے خوف زدہ تھا۔ اب میرے نیچے وہ قافلے نہ رُکتے جن کی بولی میں دعا ہوتی تھی۔ بلکہ وہ پگڈنڈیاں جن پر کبھی بزرگوں کے قدم گونجا کرتے اب انگریز کی وردی کے بوٹوں کی چاپ سے گونجتی تھیں۔ جی ہاں، اب وہ تاج، جو کبھی دہلی میں سجا کرتا تھا لندن کے محلوں میں آنکھ جھپکتے میں بدل دیا گیا۔ میرے نیچے بیٹھنے والے فقیر اب زنجیروں کی فریاد نہیں کرتے تھے

بلکہ آزادی کا خواب لیے اپنے ہی سایوں سے نظریں چُرا کر جیتے تھے۔ میرے قدموں میں بسنے والے گاؤں کی کچی گلیاں اب پکی سڑکوں میں تبدیل ہونے لگی تھیں مگر ان راستوں پر آنے والے اپنے پیچھے غلامی کے نشان چھوڑ جاتے تھے۔

میں نے پہلی بار اپنے نیچے اردو، پنجابی، انگریزی — تین زبانوں کا ہجوم دیکھا۔ نہ کوئی ایک اپنی رہی، نہ دوسری بیگانہ۔ زبانیں اب جذبوں کی نہیں تقرری کے احکامات اور دفتروں کی پابند ہو چلی تھیں۔ تعلیم کے نام پر اک نیا چالاک نظام آیا جہاں الفاظ تو سیکھے گئے مگر فہم مٹا دی گئی۔ مدارس کے دروازے بند ہونے لگے اور مشنری اسکولوں کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ میرے نیچے بیٹھنے والے لڑکے اب بابا فرید کے اشعار کی جگہ god is love کی گردان کیا کرتے۔ عورت، جو میرے نیچے بیٹھ کر چرخے پر دھاگہ کاتا کرتی تھی اب مشین کی آواز میں اپنی شناخت کھو بیٹھی۔ صوفی اور شاعر، جن کی باتوں سے کبھی میرا سایہ گونجتا تھا، اب شہر کی دیواروں پر ماضی کے نشان بن چکے تھے۔

اور جب 1857 آیا...

میرے نیچے کی زمین لرز اٹھی۔ پھانسی کے تختے، توپوں کی دھمک، اور وفاداری کے امتحان۔ اس کا نام جنگ آزادی رکھا گیا— مگر میرے تنے پر اس کا مطلب صرف ایک نیا قفل تھا۔ ہندو، مسلم، سکھ — سب لڑے، سب ہارے، اور انگریز جیت گیا۔ ایسی جیت، جو صرف جسم کی نہیں، بلکہ روح کی غلامی کا آغاز تھی۔

پھر جب ریل گاڑیاں آئیں، تو میرے نیچے کا گاؤں شہر سے جڑ گیا مگر دلوں کی دوری بڑھ گئی۔ نئی بستیاں بننے لگیں، نئی صف بندیاں، نئی ذات پات، نئے ادارے، نئے سردار، مگر سب میں اک پرانا دکھ "— ہم کہاں کھو گئے؟"

اب میں بھی خاموش رہنے لگا، میری چھاؤں بوجھل ہو چلی تھی اور میری جڑوں میں ایک عجیب سی بے چینی سرسرانے لگی تھی۔ کیونکہ میں جان گیا تھا کہ اگلا دن، خون کی بو سے لتھڑا دن ہے۔

میرا نواں دن ہوا، شام ہوئی، رات ہوئی، اگلا دن آ گیا۔

میں وہی برگد ہوں... وقت کی ہزار سالہ سانسوں کا خاموش گواہ جس کے سائے میں کبھی اذان کی صدا گونجتی تھی تو کبھی بانسری کی نغمگی۔

پر یہ دن ـــ یہ دن میرے وجود پر لگنے والے زخم کا آخری گواہ بنا۔ ابتدا میں ایک عجیب سی امید تھی جیسے مٹی خود کوئی

کونپلوں کے لیے تیار کر رہی ہو۔ تعلیم عام ہونے لگی، نوجوانوں نے کتابیں اٹھائیں اور میرے نیچے بیٹھ کر نئی باتیں کرنے لگے: قوم، شناخت، آزادی، خودی۔

اقبال کے اشعار میرے سائے میں گونجتے اور جناح کی دھیمی آواز ہوا میں اک نئی صبح کی نوید بن کر ابھرتی۔ میں نے سنا کہ اب مسلمان الگ وطن چاہتے ہیں جہاں ان کے عقائد، ثقافت، رسم ورواج — سب محفوظ ہوں گے۔

میں خاموش رہا... کیونکہ میری شاخیں ہندو کے ہار میں بھی تھیں، اور سکھ کی دھوتی کے سائے میں بھی۔ پھر 1947 آیا — اور زمین پر قیامت اتری۔ ہجرت؟

نہیں...

یہ تو زخم تھا جو قدموں سے دل تک لگا۔ میری جڑوں میں لہو اتر آیا، جو قافلے میرے سائے میں رکتے تھے، اب زخمی جسموں، جلتے چولہوں، اور سسکتی عورتوں کے قافلے بن چکے تھے۔ میں نے مائیں دیکھی جو اپنے بچوں کو میری جڑوں میں دفن کر گئیں، میں نے وہ بوڑھے دیکھے جو دو زبانوں کے بیچ خود کو اجنبی سمجھ کر دم توڑ گئے۔ میرے پتے کانپنے لگے ۔میری چھال چیخنے لگی اور میں — برگد — محض ایک خاموش تعزیت نامہ رہ گیا۔

پھر ایک نیا ملک وجود میں آیا — پاکستان۔ نیا جھنڈا، نیا ترانہ، نئی اُمید — مگر روح میں پرانی تھکن۔ اب میرے نیچے بیٹھنے والے بچے اردو بولتے لیکن پنجابی، سرائیکی، پشتو، سب زبانیں آپس میں الجھنے لگیں۔ دین کے نام پر سیاست ،ثقافت کے نام پر طبقاتی تقسیم۔

اور آزادی کے خواب... بیوروکریسی کی میزوں پر دفن ہو گئے۔

اب میرے نیچے فلمی گانے گونجتے تھے، ریڈیو کی خبریں، اور کبھی کبھار کسی شاعر کی تنہا صدا۔ پرانے فقیر اب دکھائی نہ دیتے، صرف پوسٹر چپکے،

نعرے لگتے اور قوم پرستی کے نام پر نئی دیواریں کھڑی ہوتیں۔

اور پھر... فوجی وردیاں آئیں اور جمہوریت کے خواب بوسیدہ ہو گئے۔ میرے پتے جیسے ہر مارشل لا پر جھڑتے، ویسے ہی ہر الیکشن پر کچھ امید سے پھراگتے۔

میں نے سقوطِ ڈھاکہ بھی دیکھا... جیسے ایک شاخ خود سے کاٹ دی گئی ہو۔ میں رویا — مگر میری زبان کٹی ہوئی تھی۔ اس دن کے آخر میں جب میں خود کو دیکھا تو میں بھی بدل چکا تھا۔ میری چھاؤں میں اب نہ محبت بیٹھتی تھی نہ

تہذیب۔صرف دیواریں، تقسیمیں ،اور سوالات۔

میں تنہا ہو گیا۔

میرا دسواں دن ہوا، شام ہوئی ،رات ہوئی ،اگلا دن آ گیا۔

یہ میرا آج ہے۔

میں... برگد...

جو ایک زمانے میں قافلوں کی پناہ گاہ تھا اب ایک کھنڈر کی مانند کھڑا ہوں۔میری شاخیں اب نہ بانسری کی لے پہ جھومتی ہیں نہ اذان کی گونج سے لرزتی ہیں۔بس خامشی ہے—اور اس خامشی میں ماضی کی چیخیں۔آج کا دن میرے لیے نیا نہیں بس زخموں کا وہ تسلسل ہے جو وقت کی نبض میں دھڑکتا چلا آیا ہے۔اب میرے سائے میں بیٹھنے والے کتاب نہیں، موبائل تھامتے ہیں۔آنکھوں میں حیرت نہیں اک بیزاری سی ہے۔گھڑی کی سوئیاں ان کے مزاج پر حکومت کرتی ہیں اور زمین... جس نے مجھے جنم دیا تھا، اب اس پر سیمنٹ، لوہا اور کنکریٹ کی زبان بولی جاتی ہے۔میری جڑوں کے پاس اب وہ چشمہ نہیں رہا جو کسی درویش کے وضو کا مقدس گواہ ہوتا تھا۔نہ وہ پرندے جو پنجابی لوک گیتوں کی طرح میری شاخوں میں گونجتے۔مجھے کبھی یونیورسٹی کے طالب علم" کلچرل آئیکون " کہتے ہیں کبھی "بایوڈائیورسٹی " کا حصہ۔کوئی مجھے چھونے آتا ہے تو صرف تصویر کے لیے۔جیسے میں کوئی نایاب مجسمہ ہوں—زندہ لاش۔

اب ثقافت ایک "ایونٹ " ہے، محبت ایک "ڈیجیٹل رشتہ "، اور دعا محض رسمی جملہ۔میں نے دیکھا کہ مذہب اب ایک بحث کا عنوان ہے،

نہ کہ عشق کا اظہار۔سچ اب دلیل سے نہیں ٹرینڈنگ ہیش ٹیگ سے پہچانا جاتا ہے۔سیاستدان میرے سائے میں آکر تصویریں کھنچواتے ہیں پھر بھول جاتے ہیں کہ اسی برگد کے نیچے ایک کسان نے اپنا آخری نوالہ بیٹے کو کھلایا تھا۔اب دیہاتی بھی شہر کی زبان بولتے ہیں، نہ پنجابی کا وہ سرور، نہ سرائیکی کا وہ سوز، بس انگریزی کے الفاظ—جو نہ زمین سے نکلے، نہ آسمان سے اترے بلکہ کمپیوٹر کے اسکرین پر اگے۔

برگد اب صرف سایہ نہیں—ایک علامت ہے اس تہذیب کی جو خود سے شرمندہ ہے۔میں آج اجنبی ہوں۔ایک بیگانہ جسم جو اپنی ہی زمین پر بوجھ بن چکا ہے۔مگر پھر بھی میری شاخوں میں کہیں کوئی پرانا پتا سرسراتا ہے جیسے ماضی کی کوئی

آہٹ ابھی زندہ ہو۔ کبھی کبھار کوئی بچہ آ کر

میرے تنے سے لپٹ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں... شاید کل پھر کوئی لوک گیت جنم لے، کوئی درویش مجھے زیارت بخشے، یا کوئی شاعر میرے نیچے بیٹھ کر "دھرتی" کا مطلب دوبارہ لکھے۔

لیکن یہ بھی شاید...

ایک خواب ہے۔

ایک جوتے کی آپ بیتی

میں اب وہ نہیں جو کبھی تھا۔ چمک میرے وجود سے رخصت ہو چکی ہے، جیسے سورج کسی بے کنار صحرا کے پیچھے ڈوب جائے۔ میرا رنگ اب دھندلی مٹی کا عکس ہے، میری ساخت بکھرے ہوئے بادلوں جیسی، جن کا کوئی سرا نہیں۔ میرے تلوے میں چھید ہے، اور میرے تسمے ہوا میں الجھی ہوئی کہانیوں کی مانند الجھ چکے ہیں۔

میں تنہا نہیں ہوں — میرے گرد گزرے وقت کی کچرا کنڈی ہے، جو اپنے اندر صرف مٹی کے ذرات نہیں، بلکہ تاریخ کے پژمردہ پتے، انسانی فہم کی ٹھٹھری ہوئی سانسیں، اور حسرتوں کے ٹوٹے ہوئے کھلونے سمیٹے ہوئے ہے۔

میرے پہلو میں ایک شکستہ مٹی کا پیالہ ہے، جس میں شاید کسی معصوم بچے نے کبھی دودھ پیا ہوگا۔ ایک کٹی پھٹی تصویر بھی ہے، جس میں ایک عورت کی دھندلی آنکھیں ہیں — جو اب شاید قبر کے پردے میں مدفون ہوں۔ ایک پرانا ریڈیو بھی ہے، جس کا بولنا اب صرف خامشی کا نوحہ بن چکا ہے۔ یہ سب میرے ساتھی ہیں — وقت کی نگری کے وہ بے آواز باشندے، جن کی چیخیں اب صرف ہوا میں سرگوشی بن کر رہ گئی ہیں۔

میرے وجود پر وقت نے بے شمار خطوط کھینچے ہیں — گرد و غبار کی صورت، رگیدے ہوئے چمڑے کی طرح۔ میں ایک بے جان شے ہوں، مگر میرے اندر ایک زندہ تاریخ ہے۔

میں وہ ہوں، جس کے ساتھ کسی وقت کسی انسان نے زندگی کی راہوں پر قدم رکھا تھا۔ میں نے بارشوں میں بھیگا، دھوپ میں جھلسا، میلوں چلتا رہا، کبھی مسجد کی دہلیز پر جھکا، کبھی کسی قبر پر کھڑا ہوا۔ اور آج؟ آج میں اس کچرے کی دیوار

کے سائے میں ہوں، جہاں چوہے اور بلیاں سیاست اور خوابوں کے درمیان آنکھ مچولی کھیلتی ہیں۔

ایک کتا، جو خود بھی وقت کی زنجیروں میں الجھا ہوا ہے، روز مجھے سونگھتا ہے، پھر پلٹ کر اپنی دنیا میں لوٹ جاتا ہے— شاید اسے میرے اندر کسی گزرے انسان کی مہک محسوس ہوتی ہے، یا کسی بوسیدہ خواب کا ذائقہ۔

میں اب محض ایک جوتا نہیں، بلکہ ماضی کا مزار ہوں۔ میرا ہر سوراخ، ہر چمڑے کی دراڑ، ایک داستان ہے۔

اور آج، جب میں اس خاموشی کے جنگل میں اپنے آخری دن گن رہا ہوں، تو دل چاہتا ہے کہ اپنی کہانی سناؤں— وہ کہانی جو کسی کی قربانی، کسی کی محنت، اور کسی کے غرور کے سائے میں پروان چڑھی۔

ہاں! میں ایک عام جوتا نہیں— میں ایک عہد کا راز ہوں، ایک سفر کی یاد ہوں، ایک آدمی کی شناخت، اور ایک خاندان کی تقدیر۔

مجھے اب اس بات سے غرض نہیں کہ کوئی میری بات سنے گا یا نہیں، مگر جب ماضی خود کو دہرانے لگے، تو خاموشی بھی بولا کرتی ہے۔

آج، میں بولوں گا— اپنے زخموں کی زبان میں، اپنی راکھ کے لہجے میں۔

تو سنو...

میری کہانی وہاں سے شروع ہوتی ہے، جہاں زندگی خود کو ایک بے زبان وجود کے سپرد کرتی ہے— ایک گائے کے بدن سے۔

میں ایک گائے کی کھال تھی، عمر رسیدہ، تھکی ہوئی، اور وقت کے دسترخوان پر آخری نوالہ۔ مگر جب میں جوان تھی، تو میرے جسم پر چمکدار روئیں تھے، میری آنکھوں میں حیرتوں کے خواب، اور میرے قدموں میں زندگی کی صدا۔

میں نے اپنے وقت میں کئی انسانوں کو آتے جاتے دیکھا— کچھ ہنستے، کچھ روتے، کچھ مانگتے، کچھ دیتے۔ مگر جو میں نے سب میں مشترک پایا، وہ ان کی نظر میں مفاد کا رنگ تھا۔

میں اس کھیت میں پلی، جس کے کنارے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میرے مالک ایک نیک دل کسان تھے، جو مجھے صرف دودھ کے لیے نہیں، بلکہ ایک جیتی جاگتی مخلوق کی طرح رکھتے۔

ہر صبح، جب سورج دھرتی کی پیشانی پر بوسہ دیتا، میں کھلیانوں میں نکلتی، شبنم میرے پاؤں چومتی، اور چڑیوں کے نغمے میرے کانوں میں گونجتے۔

میرے ساتھ ایک بیل بھی تھا، جو ہل جوتنے میں کسان کا شریک تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا، " گائے! انسان کبھی تمہیں تمہاری آنکھوں کی نرمی سے نہیں، تمہارے جسم کی پیداوار سے پہچانتا ہے۔"

پھر ایک بکری تھی، چنچل اور نازک، جو ہر وقت پھدکتی رہتی۔ وہ کہتی، " میں تو زندگی کو گیت سمجھتی ہوں، مگر انسان نے اسے منڈی بنا دیا ہے۔"

وقت گزرتا رہا۔ میں نے کئی بچوں کو دودھ پلایا، کئی تہواروں میں قربانیوں کا منظر دیکھا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ بیل کو قصائی لے گیا — وہی بیل جس نے میرے ساتھ سالوں کھیت جوتے۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے الوداع کہا — اور اس دن میں پہلی بار خاموش ہوئی۔

پھر ایک دن میری باری بھی آ گئی۔

میرے جسم کی ہڈیوں میں عمر کی تھکن بولنے لگی تھی، دودھ اب تلخ خواب بن چکا تھا۔ میرا مالک مجھے دیکھ کر خاموش ہو جاتا، جیسے کوئی ماں اپنی بیمار اولاد کو آخری بار دیکھے۔

بالآخر، مجھے بیوپاری کے حوالے کر دیا گیا۔

بیوپاری نے مجھے شہر کی ایک پرانی منڈی میں لا کھڑا کیا۔ میرے گرد شور تھا — چیخیں، سودے، آوازیں — اور ان سب کے بیچ میں میں تھی، خاموش، پرسکون، جیسے تقدیر کے ہاتھوں لکھی تحریر کو قبول کر چکی ہوں۔

ایک قصائی نے مجھے خریدا۔ نہ محبت، نہ رحم، بس ایک سودا۔ مجھے ایک نیم روشن صحن میں لایا گیا، جہاں دیوار پر لٹکتے چھریوں کے سائے میرے دل پر لرزہ طاری کر گئے۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں —

آنکھیں کھولیں تو خود کو کھال کی شکل میں پایا۔ وہی کھال جو کسی زمانے میں شبنم سے بھیگتی، سورج سے چمکتی، اور بچوں کی تھپکیوں سے دھڑکتی تھی۔

اب وہ ایک بے جان پرت بن چکی تھی، جسے جلدی سے دھو کر ایک گاڑی میں ڈال دیا گیا۔

وہ گاڑی، جس میں کئی اور کھالیں تھیں — کچھ بھیڑوں کی، کچھ بکریوں کی، کچھ بیلوں کی۔ سب کی اپنی اپنی کہانیاں، مگر اب سب ایک ہی بدبو میں سانس لے رہے تھے۔

ایک جلد فروش نے ہمیں خریدا۔ وہ ایک خستہ حال دکان میں بیٹھا تھا، جہاں دیواروں پر پرانے اخبار چپکے ہوئے تھے،

جن میں کسی زمانے کی بڑی شخصیات کی تصویریں جھانک رہی تھیں۔

جلد فروش نے مجھے ہاتھ میں لے کر کہا:

"یہ عمدہ چمڑا بنے گا، شاید کسی جوتے میں ڈھلے گا، شاید کسی افسر کے بیگ میں لگے گا۔"

مجھے پہلی بار محسوس ہوا کہ میری موت رائیگاں نہیں گئی — میرے جسم کا ایک ٹکڑا کسی اور کی زندگی کا حصہ بننے جا رہا تھا۔

میرے ٹکڑے کو بڑی احتیاط سے پیک کیا گیا، اور پھر کئی کھالوں سمیت اسے شہر کی ایک پرانی ٹینری کو بھیج دیا گیا۔

ٹینری — جہاں زندگی کا مفہوم گلی سڑی بدبو میں لپٹا ہوا تھا اور وقت نمک، چونے، اور تیزاب کے قطروں میں تحلیل ہو رہا تھا۔ یہ جگہ انسان کے خوابوں کی نہیں، بلکہ ضرورتوں کی کوکھ سے نکلی تھی؛ یہاں کوئی خوشبو نہ تھی، نہ نرمی، نہ زیبائش، فقط کھالوں کے ڈھیر تھے، جن پر مزدوروں کے پاؤں یوں پھسلتے جیسے وقت زمین پر گر پڑے۔

میری کھال، جو کبھی ایک جاندار جسم کی عزت تھی، اب کئی اور کھالوں کے ساتھ ایک حوض میں ڈالی گئی۔ اس حوض میں پانی سیاہی کی طرح کالا ہو چکا تھا، جیسے کسی زخمی تاریخ کے زخم رس رہے ہوں۔ نمک کی تیز لہریں میرے وجود سے خون، بال، اور زندگی کے ہر نشان کو چھیننے لگیں۔

پھر مجھے باہر نکالا گیا، چونا میرے اوپر یوں پھیرا گیا جیسے وقت اپنے نقش ثبت کر رہا ہو۔ میرے خلیوں میں سنّاٹا بھر گیا۔ میں جان چکی تھی، میں اب گائے نہیں ہوں — میں چمڑا ہوں، ایک خام مواد، جو اپنی پہچان کھو کر کسی اور کی شناخت بنے گا۔

مجھے رگیدا گیا، کھینچا گیا، دھویا گیا، تیزاب میں ڈالا گیا، جیسے مجھ میں موجود ہر جذبہ، ہر یاد، ہر لمس کو مٹا دیا جا رہا ہو۔

کچھ کھالیں بیگوں کے لیے جدا ہو گئیں، کچھ دستانوں کے لیے، کچھ چمڑے کی جیکٹس میں ڈھلنے کے لیے رکھی گئیں — اور میں؟ میں چنا گیا کہ ایک جوڑا جوتا بنوں، شاید کسی عزت دار پاؤں کی زینت۔

پھر مجھے خوشبو دی گئی — نہ وہ فطری خوشبو جو سبز گھاس کی صبح میں ہوتی ہے، بلکہ وہ بناوٹی مہک جو شہر کی گلیوں میں عزت کا معیار سمجھی جاتی ہے۔

ایک کاریگر نے مجھے کاٹا، گوندھ کر ایک نیا روپ دیا۔ میرے اندر چمک آ گئی — ایک مصنوعی چمک، جو اصل سے زیادہ دلفریب تھی۔

پھر مجھے ایک پرانے تھیلے میں رکھ کر شہر سے دور ایک گاڑی میں لاد دیا گیا۔ گاڑی کی منزل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جہاں

کچھ اور چمڑے بھی بھیجے جا رہے تھے۔

میرے ساتھ ایک نرم کھال تھی جو کسی بکری کی معلوم ہوتی تھی، وہ بہت سہمی ہوئی تھی، جیسے جانتی ہو کہ اسے ایک عورت کے پرس میں بدلنا ہے، جہاں وہ عمر بھر صرف زیور، شیشہ اور کنگھی اٹھائے گی۔۔۔ مگر کبھی کھل کر ہنس نہ سکے گی۔

جب گاڑی رکی، میں ایک معمولی سے جوتا ساز کے ہنرکدہ میں اُتارا گیا۔۔۔ ایک ایسی جگہ جہاں نہ مشین تھی، نہ فیکٹری، بس دو ہاتھ تھے، اور خوابوں سے بھرپور دو آنکھیں۔

وہ ایک چھوٹا سا کچا آنگن تھا، جس کی دیواریں مٹی کی تھیں مگر ان پر وقت نے فن پارے تراش رکھے تھے۔۔۔ کہیں دھوپ کے نشان، کہیں بارش کی دھاروں کے دھبے، اور کہیں بچوں کے ہاتھوں سے بنائے گئے وہ خاکی خاکے جنہیں کوئی عجائب گھر محفوظ نہ کر سکا۔

اسی آنگن کے کنارے پر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔۔۔ نیم اندھیرا، مگر زندگی سے بھرا ہوا۔ یہی بابا رحمت کا گھر تھا یہی دوکان۔۔۔ ایک ہنرکدہ جہاں خوابوں کو چمڑے میں ڈھالا جاتا، اور ہاتھوں کی لکیروں سے قسمت تراشی جاتی۔

بابا رحمت خود بھی اس کمرے کی مانند تھا۔۔۔ جھریوں سے بھرا، مگر روشنی سے محروم نہیں۔ اس کی پلکوں پر تجربے کی دھول جمی ہوئی تھی، اور آنکھوں میں کسی کھوئی ہوئی جوانی کا عکس۔

وہ دن بھر اپنے ہنر سے جوتے بناتا، سلائی کرتا، تسمے گوندھتا، مگر ہر شام، اپنے پوتے کو گود میں بٹھا کر ایک نئی کہانی سناتا۔ کبھی قافلوں کی، کبھی فقیروں کی، کبھی ان جوتوں کی جنہوں نے بادشاہوں کے قدم چومے اور کبھی ان کی جنہیں درویشوں نے پہنا۔

بابا رحمت کا گھر چھوٹا ضرور تھا، مگر اس کے دل میں ایک پوری دنیا بستی تھی۔ اس کی بیٹی، نور بی بی، سلائی کا کام کرتی، اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو گھر میں قرآن پڑھاتی۔

اس کا بیٹا، جو کسی وقت کا حافظِ قرآن تھا، اب ایک چھوٹی سی دکان چلاتا، اور کبھی کبھی گاؤں کے بچوں کو سبق پڑھا دیتا۔

ان کا کھانا سادہ ہوتا۔۔۔ اکثر دال، یا کبھی خشک آلو۔۔۔ مگر ان کی گفتگو میں وہ چاشنی تھی جو بڑے بڑے خوانوں میں نہ پائی جاتی۔

بابا رحمت نے جب میری کھال کو پہلی بار ہاتھ لگایا، تو اس نے اسے آہستہ سے چھوا، جیسے کسی یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھ رہا ہو۔

پھر اس نے مجھے اپنی میز پر پھیلایا، اور کہا:

"یہ چمڑا خاص لگتا ہے، اس میں ایک وفاداری ہے، جیسے برسوں کی خدمت کو بھولنے سے انکار ہو۔"

میں دم بخود رہ گیا— پہلی بار کسی انسان نے مجھے سمجھا، مجھے صرف ایک مواد نہ جانا بلکہ ایک زندگی کا تسلسل مانا۔

بابا نے میری پیمائش کی، پھر لکڑی کے سانچوں میں مجھے ڈھالا۔ چھریاں چلیں، سوئیاں پیوست ہوئیں، اور دھاگوں نے میرے وجود کو نئے بندھنوں میں پرویا۔

ہر قدم پر وہ کوئی دعا پڑھتا، جیسے میں کوئی عبادت کا وسیلہ ہوں۔

جب میرے تسمے تیار کیے گئے، تو نوری بی نے انہیں اپنے ہاتھ سے کسا، اور کہا:

"یہ جوڑا کسی عزت دار کے قدموں کی زینت بنے گا۔"

پھر وہ دن آیا، جب میں مکمل ہوا— ایک جفتِ خاص، چمکتا، متوازن، اور بظاہر فخر سے سرشار۔

بابا رحمت نے مجھے ہاتھ میں اٹھایا، آنکھوں سے لگا کر دعا دی، اور مجھے ایک سفید کپڑے میں لپیٹ دیا۔

پھر اس نے اپنی پگڑی باندھی، اور مجھے لے کر گاؤں کے چودھری کے دروازے پر جا پہنچا۔

چودھری کا صحن کشادہ تھا، مگر اس کے دروازے پر بابا کا آنا کسی معمولی واقعہ سے کم نہ تھا۔

بابا نے احترام سے سلام کیا، اور کہا:

"یہ جوتا آپ کے قدموں کے قابل ہے حضور— اپنے ہاتھ سے بنایا ہے، اپنے دل سے تراشا ہے۔"

چودھری نے مجھے ہاتھ میں اٹھایا، دیر تک مجھے دیکھا، اور آہستہ سے مسکرا کر بولا:

"رحمتا! تمہارے ہاتھوں میں برکت ہے۔"

میں اب چودھری صاحب کے قدموں میں تھا— مگر حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی فطرت کے سائے میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ فقط ایک رئیس نہیں، بلکہ ایک مکمل انسان تھا— وقار کا مجسمہ، شرافت کا نمونہ، اور گاؤں کی روح۔ اس کی چال میں ایسا ٹھہراؤ تھا جیسے کسی بزرگ درخت کی شاخیں جھومتی ہوں، اور اس کی نگاہ میں ایسی شفقت جیسے کسی درویش کی دعا۔

چودھری کے دروازے سب کے لیے کھلے تھے— چاہے وہ مزدور ہو یا معذور، یتیم ہو یا پرایا۔ جب وہ مسجد میں داخل ہوتا، تو نمازیوں کی صف میں کوئی اونچ نیچ نہ ہوتی— وہ سب کے برابر میں کھڑا ہوتا۔

اس کی حویلی کے در و دیوار گواہ تھے کہ اس نے کبھی کسی کے حق میں کمی نہ کی، اور کسی کے ماتھے پر شکن نہ آنے دی۔

اس کے خادم اسے "حضور" کہہ کر بلاتے، مگر وہ ہمیشہ مسکرا کر کہتا:

"میں بھی وہی خاک ہوں جس سے تم بنے ہو۔"

میں، ایک جوتا، اس کے قدموں سے چمٹا، ہر روز اس کے ساتھ زندگی کی راہوں پر چلتا۔ میں نے اسے جنازوں کے پیچھے روتے دیکھا، بیماروں کے پاس بیٹھتے دیکھا، اور زمین کے جھگڑوں کو سلجھاتے ہوئے اس کے ماتھے پر فکر کی پرچھائیاں محسوس کیں۔

ہر قدم پر وہ انصاف، رحم، اور تہذیب کا استعارہ بن چکا تھا۔

مگر اس کے بیٹے کا عالم اور تھا۔

وہ جوان، مگر اندر سے کھوکھلا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہ تھی جو باپ کی آنکھوں میں تھی — بلکہ ایک ایسی سرکشی تھی جو دولت کی اندھی راہوں سے پھوٹی تھی۔

چودھری صاحب اسے علم کی روشنی دینا چاہتے تھے، درویشی کا ذوق بخشنا چاہتے تھے، مگر بیٹے نے تخت کا خواب دیکھ رکھا تھا — وہ تخت جس پر بیٹھ کر وہ اپنے باپ کی چھاؤں کا بدلہ دنیا سے لینا چاہتا تھا۔

میں نے اس بیٹے کی نظروں میں باپ کے لیے بیزاری دیکھی، اس کے جوتوں میں وہ غرور دیکھا جو صرف گناہ کی مٹی میں اگتا ہے۔

وہ دوستوں کے ساتھ رات گئے عیش میں گم رہتا، شراب، قہقہے، موسیقی — اور صبح جب باپ عبادت میں مصروف ہوتا، بیٹا خوابِ غفلت میں ہوتا۔

چودھری صاحب نے کئی بار اسے بلایا، محبت سے سمجھایا، مگر وہ ہنستا اور کہتا:

"ابا جان، اب دنیا بدل گئی ہے، اب نہ زمین کا وقت ہے نہ درویشی کا۔ اب طاقت کا زمانہ ہے، اب رعب چلتا ہے، رحم نہیں۔"

اور میں، ایک بے زبان جوتا، ہر روز اس تضاد کو چپ چاپ دیکھتا رہا — جیسے کوئی آئینہ دونوں عکسوں کو ساکت دیکھے۔

وقت گزرتا گیا، چودھری صاحب کا جسم کمزور ہونے لگا، اور آخر ایک دن وہ بیمار ہو کر بستر سے لگ گئے۔

گاؤں کے لوگ آتے، ان کے قدموں کو چومتے، ان کی خیریت پوچھتے — مگر بیٹا؟

وہ بیٹھک میں دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں مصروف رہتا، جیسے کسی پرائے آدمی کی بیماری کی خبر ہو۔

چند دن بعد، وہ لمحہ آ گیا— چودھری اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

میں ان کے پاؤں سے لپٹا رہا، جب انہیں غسل دیا جا رہا تھا۔

میری چمک ماند ہو چکی تھی، مگر میں آج بھی اپنے مالک کی لاش کے ساتھ زندہ تھا۔

بیٹے نے فوراً وراثت سنبھالی۔

اب وہ چودھری کہلاتا تھا— مگر اس کی چودھراہٹ میں نہ وہ وقار تھا، نہ وہ عزت۔

اس نے باپ کی زمین بیچنا شروع کی، حویلی کے پرانے درخت کٹوائے، دروازے بدلوائے، ملازموں کو نکالا، مسجد کی مالی امداد بند کی، اور خود کو اقتدار کا مرکز سمجھ لیا۔

اس کے قدم اب شراب خانوں میں پڑتے، سیاستدانوں کے قدموں میں جھکتے، اور بدمعاشوں کے ساتھ اٹھتے۔

میری زندگی بھی اب بے معنی ہو چکی تھی— میں کبھی اس کے کمرے کے کونے میں پڑا رہتا، کبھی خادموں کے قدموں تلے آتا، کبھی دلدلی راستوں میں گھسٹتا۔

اور پھر ایک دن، جب وہ کسی شب خون میں قتل ہوا— شاید زمین کے تنازعے پر، یا کسی پرانے دشمن کے ہاتھوں— تو اس کے ترکہ میں میں بھی شامل تھا۔

مگر اب کون مجھے پہنتا؟ میں بوسیدہ ہو چکا تھا، میرے تسمے ٹوٹ چکے تھے، میری پشت سے چمڑا اچھل چکا تھا۔

مجھے لا کر کچرے میں پھینک دیا گیا— جہاں وقت کی ہر شے آخر کار آن پہنچتی ہے۔

میں اب پھر وہی ہوں— کچرے کے ڈھیر میں ایک ساکت ماضی، ایک اجڑا ہوا عکس، ایک بیزبان گواہ۔

اب میں خاک میں گم ایک سایہ ہوں— نہ کسی قدم کا زیور، نہ کسی راہ کا ہمسفر۔

میری چمک بجھ چکی، تسمے بکھر چکے، مگر میرے اندر وقت کے وہ نقش اب بھی زندہ ہیں جنہیں کوئی موسم مٹا نہیں سکا۔

میں نے وفا کے پاؤں دیکھے، غرور کی ایڑیاں سہی، اور زوال کی گرد سونگھی۔

آج میں گمنام ہوں، مگر میرے اندر وہ سب کچھ محفوظ ہے جو انسان بھول جاتا ہے— قربانی، محنت، نیکی، اور پھر غرور، غفلت، انجام۔

میں جوتا ہوں— مگر دراصل میں ایک آئینہ ہوں...

ایک ایسا آئینہ جو پاؤں نہیں، کردار ناپتا ہے۔

اوورکوٹ کی آپ بیتی

میں ہوں... ایک اوورکوٹ، مگر اب صرف نام کا۔

میری حالت ایسی ہے کہ نہ رنگ پہچانا جاتا ہے، نہ روپ باقی ہے۔ کہیں کہیں سے چیتھڑے جھانکتے ہیں، سلائیاں بکھر چکی ہیں، اور میرے بٹنوں کی بساط بھی کب کی اجڑ چکی۔ اب میں ایک بیجان کپڑے کا تھپیڑا ہوں جو شہر کے مضافاتی کچرے کے ڈھیر پر دھواں دھار سڑانڈ میں پڑا سسک رہا ہے۔ کچھ چیتھڑے میرے سینے سے لٹک رہے ہیں، جیسے کوئی خستہ حال عاشق اپنی بکھری ہوئی زلفوں سے عشق کا ماتم کر رہا ہو۔

یہاں میرے اردگرد ہر شے میں تعفن ہے، مگر اس سے زیادہ تعفن میرے وجود میں ہے، جو زمانے کی بیوفائیوں، انسانوں کی خودغرضیوں اور وقت کی بیرحمیوں سے پیدا ہوا ہے۔ میں یہاں پڑا ہوں، لاوارث، بیمقصد... مگر میرے اندر ایک زمانہ آباد ہے؛ ایک عہد جو اب خواب بن چکا ہے۔

جب ہوا کی سرسراہٹ میرے پرزوں کو چھوتی ہے، تو ماضی کے دریچے کھلتے ہیں۔ مجھے وہ لمحے یاد آتے ہیں جب میں ایک شان دار شوکیس میں آویزاں تھا؛ روشنیوں میں نہایا ہوا، خوشبوؤں میں بسا ہوا، لوگوں کی آنکھوں کا مرکز، فیشن کی دنیا کا ایک شاہکار۔

ہاں، میں بھی کبھی کسی کی تمنا تھا۔ ایک سیاست دان نے مجھے پہنا تھا، جو عوام کے نعروں میں ڈوبا رہتا، مگر دل میں اقتدار

کا عفریت پالے رکھتا۔ میں اس کے شانوں پر فخر بن کر لہرایا کرتا، جیسے کوئی تاج کسی بادشاہ کے ماتھے پر جگمگاتا ہو۔

پھر میں ایک عالم کے جسم پر آیا، جس کی آنکھوں میں خواب تھے، مگر زندگی کی تلخیوں نے انہیں دھندلا دیا۔ میں اس کے لیے نہ صرف سردی سے بچاؤ کا ذریعہ تھا بلکہ اس کی خودداری کا پردہ بھی۔ وہ کہتا، "یہ میرے شاگرد کی نشانی ہے، جواب بڑا افسر بن گیا ہے۔"

مگر ہر چیز فنا کے اصول کے تابع ہے۔ میں بھی فنا کی سیڑھی پر چڑھ چکا۔ آخر کار میں ایک ایسے مانگنے والے کے تن پر گیا جس کی نسلیں گدائی کے خون سے سیراب تھیں۔ وہاں میرا آخری مصرف وہ عزت نہ رہا، بس جسم ڈھانپنے کا محض ایک ذریعہ تھا۔

اور آج...

آج میں یہاں ہوں، خاک وخون میں لپٹا، زندگی کے تمام مناظر کی گواہی لیے۔ اب مجھ میں نہ گرمی ہے، نہ جمال۔ صرف یادیں ہیں... جو نہ جَل سکتی ہیں، نہ مَٹ سکتی ہیں۔ میری داستان حیات سنئے، یہ ایک تمثیل ہے، ایک عبرت ہے، ایک سبق ہے۔

میری پہلی سانس ایک بھیڑ کی پشت پر اتری، جیسے نرم ہوا کا جھونکا کسی وادی؟ نیلگوں میں جا ٹھہرے۔ میں ایک زرعی جاگیردار کے وسیع وعریض گلے میں پیدا ہوا، جہاں زمین پر سبزہ ایسے بچھا تھا جیسے کسی صوفی کے خواب کا قالین۔ یہ گلہ ایک ایسی دنیا تھی جو انسانی دنیا سے ذرا مختلف تھی — یہاں جانور بادشاہ تھے اور انسان خدمت گار۔

وہ جاگیردار... اس کے قدموں سے زمین کانپتی تھی، اور اس کی آنکھوں سے خدائی جھلکتی۔ اس کا ریوڑ، اس کے خادم، اس کے چرواہے سب ایک خاص نظام میں بندھے تھے۔ ہر بھیڑ کے پیچھے ایک سایہ تھا — ایک چرواہا، جو دن رات ان کے پیچھے چلتا، ان کی غذا، ان کی نیند، ان کی نسل کشی، اور ان کی صفائی کا خیال رکھتا، جیسے کوئی ماں بچے کو جھولا جھلا رہی ہو۔

میرے جیسی کئی اور ننھی اون کی پرتیں، اس ریوڑ کی بیصدا زبان تھیں، جو خامشی سے زندگی کو چبا رہی تھیں۔

جب بہار آتی، تو یہ زرعی قطعہ جنت کا نظارہ پیش کرتا۔ سبز میدان، اونٹ کی گردن کی طرح بلند درخت، اور ان کے نیچے سفید وسیاہ بھیڑیں، جیسے کسی غزل کی ردیف میں لفظ ترتیب سے رکھے گئے ہوں۔ میں بھی انہی لفظوں میں سے ایک نازک سا لفظ تھا — خاموش، لطیف، اور بیخبر اپنی تقدیر سے۔

میرے جسد خاکی کو وجود بخشنے والی وہ بھیڑ ایک خاص نسل کی تھی۔ اس کی پیٹھ پر میری طرح سینکڑوں نرم، گھنی، اور روشن اُون کی ریشے اگتے، جنہیں چرواہے "سفید سونا" کہتے۔ جب وقت آتا — عموماً گرمی کی ابتدا میں — تو ایک بڑی تقریب کی مانند کٹائی کی رسم ہوتی۔

اُس دن ہوا بھی سنجیدہ ہو جاتی۔ چرواہے اپنے اوزار تیز کرتے، قینچیاں چمکنے لگتیں، اور بھیڑیں خاص حصار میں جمع کی جاتیں۔ میں اس لمحے کو کبھی نہ بھول سکا جب وہ تیز چاقو میری ماں جیسی بھیڑ کی پشت پر پھسلا، اور میں، اپنے سینکڑوں ساتھیوں سمیت، جدا کر لیا گیا۔

ایسا لگا جیسے کسی صوفی کا دل اس کے مرشد سے الگ کر دیا گیا ہو — بظاہر نرمی، مگر باطن میں ایک چیخ پوشیدہ۔

ہم اون کے گالے اب تنہا ہو گئے تھے۔ ہماری نرم، سفید سانسیں کسی بوری میں قید کر لی گئیں، اور ہم ایک گاڑی میں ڈال دیے گئے، جو ہمیں فارم کی پُرسکون فضا سے نکال کر ایک شوریدہ دنیا کی طرف لے جا رہی تھی۔

راستے بھر ہمیں جھٹکے لگے، جیسے کسی درویش کے وجدان میں تلاطم پیدا ہو گیا ہو۔ ہم اُس مل کی طرف جا رہے تھے جہاں ہمارا دوسرا جنم ہونا تھا — جہاں ہمیں زندگی کے معنی بدل کر ملنے تھے، جہاں ہم ایک نئی شناخت پانے والے تھے، مگر کس قیمت پر... یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔

جاگیردار، جس کی زمین پر ہم پیدا ہوئے، وہ ہمیں دیکھنے آیا کرتا تھا۔ نہ محبت سے، نہ فخر سے — بلکہ ایسے جیسے ایک سوداگر اپنے مال پر نظر ڈالتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں ہم صرف تول کا سامان تھے۔

لیکن چرواہے، وہ لوگ جن کے ہاتھوں نے ہمیں سنبھالا، جن کی آوازوں میں ہم نے پرورش پائی، ان کے چہروں پر ہم سے جدائی کا ایک لطیف دکھ تھا۔ وہ ہمیں چپ چاپ دیکھتے، جیسے کسی فقیر نے اپنا واحد کٹورا کسی رئیس کے قدموں میں رکھ دیا ہو۔

ہماری روانگی کے وقت، فارم کے سب خادم ایک طرف کھڑے تھے۔ ایک بوڑھا چرواہا، جس کی داڑھی میں وقت کی گرد تھی، میری طرف دیکھ کر زیرِ لب کچھ بولا — شاید کوئی دعا، شاید کوئی الوداعی مصرع — مگر شور میں الفاظ گم ہو گئے۔

اب ہم کارخانے کے دروازے پر تھے۔

ایک نئی دنیا، نئی آوازیں، نئی خوشبوئیں — اور میں، ایک ٹوٹے ہوئے خواب کی طرح، بس یہ دیکھ رہا تھا کہ کس انداز سے میرا اگلا جنم مجھے قریب لے رہا ہے۔

مل کے دروازے پر پہلا قدم، گویا میرے نازک وجود پر تقدیر کا پہلا چابک تھا۔

فضا میں تیل، پسینے، دھول، اور مشینوں کے شور کی آمیزش نے ایک وحشت ناک ماحول تخلیق کر رکھا تھا۔ یہاں کسی چیز کی سانس آزاد نہ تھی — نہ انسان کی، نہ اون کی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں ہر شے کو مشین میں جھونک کر اس کی اصل چھین لی جاتی ہے۔ میں، جو کل تک نرم ہواؤں میں جھومتا تھا، آج لوہے کے جبڑوں میں جھونکا جا رہا تھا۔

مل کا در و دیوار سیاہ تھا — نہ صرف رنگ میں بلکہ مزاج میں بھی۔ اندر مزدوروں کی ایک فوج تھی؛ آنکھوں میں نیند کی جگہ پیلاہٹ، چہروں پر خوشی کی جگہ تھکن، اور زبانوں پر خاموشی کی مہریں۔ ان کے ہاتھ تیز، مگر روحیں ماند پڑ چکی تھیں۔

ہمیں بوروں سے نکالا گیا، جیسے کسی زمانے کی داستانوں کو کتب خانوں سے نکال کر بھٹی میں جھونک دیا جائے۔ مشینیں ہمیں نگلنے لگیں۔ ہم اون کے گالے، جو کل تک قدرت کے لمس سے معطر تھے، اب چکیوں میں پسنے لگے۔ ہمارا ریشہ ریشہ الگ کیا گیا، ہمیں تولا، پرکھا، پھر گرم پانی میں ڈالا گیا — جیسے انسان کو دنیا کی آگ میں ڈالا جائے تا کہ وہ اپنے رنگ و بو کھو دے۔

کتائی کی مشینوں میں ہماری سانسیں لمبی دھاگوں میں بدلنے لگیں۔ ہر چکر کے ساتھ ہم اپنے آپ کو بھولنے لگے۔ دھاگے بنے، مگر ساتھ ہی ہمارے خواب، شناخت اور اصل بھی کسی غیر مرئی دھاگے میں لپٹنے لگے۔ یہاں کوئی احساس باقی نہ تھا۔ صرف رفتار تھی، جو مشینوں کی طرح بیرحم اور بیمروّت تھی۔

کارخانے کا مالک ایک سخت گیر سرمایہ دار تھا، جس کی آنکھ میں صرف حساب تھا۔ نہ انسانیت، نہ احساس۔ وہ ایک آرام دہ دفتر میں بیٹھا ہمیں دیکھتا، جیسے کوئی سورج پر بھی سایہ ڈالنے کا دعویدار ہو۔ مزدوروں کی چیخیں، آہوں، اور دعائیں اس تک نہ پہنچتی تھیں۔ وہ صرف پیداوار، نرخ، اور ترسیل کی زبان جانتا تھا۔ سارے ملازمین اس کے ہاتھ کے پرزے تھے۔ وہ خود بھی غلام تھے نظام کے، اور ان کے ماتحت بھی۔

ایک کاریگر تھا جس کے چہرے پر عمر کے نقوش ایسے گہرے تھے جیسے کسی پرانی عمارت پر وقت نے اپنے ناخن چبائے ہوں۔ وہ مشینوں کے درمیان یوں گھومتا جیسے قید خانے کا داروغہ، ہر وقت ایک سختی اس کے لہجے میں اور ایک کرختگی اس کی نظر میں۔

اس مل میں صرف دھاگا نہیں بنتا تھا — یہاں آنسوؤں کی ریشمی زنجیر بھی بنتی تھی، یہاں خاموشیوں کو رولا کر بان دیا جاتا تھا، یہاں ہر دھاگے میں مزدور کی تھکن، اس کے بچوں کی بھوک، اس کی بیوی کا انتظار، سب کچھ لپیٹا جاتا تھا۔

جب میں دھاگہ بن چکا، تو مجھے بُنائی کے حصے میں پہنچا دیا گیا۔ اب میرا جسم کپڑے کی صورت میں ایک نئے انداز میں سامنے آ رہا تھا۔ بُننے والے ہاتھوں میں ایک فن تو تھا، مگر وہ فن خوشی سے خالی تھا۔ جیسے کوئی مصور اندھیری رات میں سورج بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔

میری بُنائی کا کپڑا سیاہ تھا، مگر اس میں چمک تھی۔ شاید اس لیے کہ میں ایک خاص خانے کے لیے تیار کیا جا رہا تھا۔ ماہر بُننے والوں نے مجھے خاص سلوٹوں، خاص نقشوں اور خاص بُنت کے ساتھ تیار کیا۔ ہر دھاگہ اپنے ماضی کی کہانی سناتا تھا، مگر کوئی سننے والا نہ تھا۔

اب میں ایک کپڑے کی شکل میں تیار ہو چکا تھا — مگر میری مسافت ابھی باقی تھی۔

مجھے گُٹھری کی صورت میں لپیٹا گیا اور ایک بڑے گودام میں منتقل کیا گیا، جہاں مجھ جیسے سینکڑوں کپڑے رکھے تھے۔ ہر کپڑا اپنی الگ زبان، الگ کہانی، اور الگ تقدیر کا نمائندہ تھا۔

ایک دن مجھے نکالا گیا۔ میرے گرد ہنرمند ہاتھوں نے دوبارہ حرکت کی۔ اب میں سلائی کی فیکٹری میں تھا۔ یہاں شور کم تھا، مگر ماحول زیادہ اداس۔ کاریگر زیادہ تر خاموش تھے، جیسے وہ نہ کام کر رہے ہوں، نہ جی رہے ہوں، بلکہ صرف وقت کے شکنجے میں پھنسے ہوں۔ میرے لیے خاص تراش خراش کی گئی۔ قینچیوں کی آواز نے مجھے میری حدوں سے کاٹا، سوئیوں نے میرے تن میں تقدیر کے نقش بنائے، اور دھاگوں نے میری قسمت کو سی دیا۔

جب سلائی مکمل ہوئی، تو میں ایک شاندار اوورکوٹ کی صورت میں منظر پر آیا۔ آئینے میں میرا عکس کسی شہزادے کی طرح دمک رہا تھا۔ میں نیا، خوشبودار، نفیس اور متکبر لگتا تھا — مگر اندر کہیں ایک چیخ چھپی ہوئی تھی، وہی چیخ جو مشینوں نے میری روح سے چھینی تھی۔

مجھے ایک مشہور دکان میں آویزاں کر دیا گیا — شہر کے سب سے مہنگے بازار میں، جہاں ہر چیز کا مول صرف روپیہ نہیں، سماجی مرتبہ بھی ہوتا ہے۔ دکان کی روشنیوں میں نہایا ہوا، میں ہر گزرتی آنکھ کا مرکز تھا۔ لوگ مجھے چھو کر کہتے، "واہ، کتنا قیمتی کوٹ ہے"!

مگر کوئی یہ نہ جان سکا کہ میری قیمت روپوں سے نہیں، آنسوؤں، تھکنوں، اور خوابوں سے بنی ہے۔

پھر ایک دن وہ لمحہ آیا — ایک طاقتور، مغرور، اور باوقار شخص دکان میں آیا۔ دکاندار نے میرا ذکر کیا، اور اس شخص نے مجھے خریدا... بغیر کسی پس و پیش کے۔

میں اب ایک جسم پر تھا—ایک ایسا جسم جس کے گرد سروں کی بھیڑ تھی، اور جس کے قدموں تلے ضمیروں کی مٹی کچلی جا رہی تھی۔

وہ سیاست دان تھا۔ وہ مجھے خرید کر اپنے شانوں پر لے آیا تھا، نہ صرف اقتدار کا نمائندہ تھا بلکہ خود کو اقتدار سمجھتا تھا۔ اس کے قدموں کے نیچے فرش مخملی تھے، مگر اس دل کے اندر خارزار بستے تھے۔ اس کی مسکراہٹ نرم، مگر نگاہیں خنجر تھیں۔ اور میں—میں اس کے وجود پر ایک تمغے کی مانند آویزاں تھا۔ ایسا تمغہ جس میں فیشن بھی تھا، فریب بھی، اور فخریہ سرد مہری بھی۔

جب وہ مجھے پہلی بار زیب تن کر کے عوامی جلسے میں نکلا، تو ہزاروں زبانوں نے اس کی تعریف کی۔

"واہ! کیا جاہ و جلال ہے"!

"دیکھو، لباس سے رعب ٹپکتا ہے"!

مگر کسی نے یہ نہ جانا کہ میں کن آنسوؤں، کن تھکنوں، اور کتنے پکاروں سے بُنا گیا ہوں۔ میری چمک کے پیچھے مزدوروں کی جلتی سانسیں تھیں، اور میری تراش کے پیچھے مشینوں کی کربناک کراہیں۔

وہ جلسے میں تقریر کرتا، تو میں اس کے سینے پر جھولتا، جیسے الفاظ کی سچائی کا ضامن ہوں۔

مگر میں جانتا تھا، ہر تقریر جھوٹ کی فصل تھی۔ ہر وعدہ ایک زہر آلود بیج تھا جو عوام کے ذہنوں میں بویا جاتا۔

جب وہ "قومی خدمت" کی بات کرتا، تو میں کانپ اٹھتا۔ کیونکہ میں اس کے دل کے قریب تھا، اور مجھے اس کی نیتوں کی بو آتی تھی—وہ بو جو خزاں سے زیادہ زہریلی تھی۔

وہ صاحب اقتدار نہ صرف کرسی کا اسیر تھا بلکہ ضمیر کا دشمن بھی۔ اس کے محل نما گھر میں داخل ہوتے ہی میں حیرت سے پتھر ہو جاتا۔ دیواروں پر قیمتی مصوریاں، پردوں میں خوشبو کی تہیں، اور ہر کمرے میں نوکر— مگر ان سب کے درمیان ایک چیز مفقود تھی: سچائی۔

اس کے دفتر میں رشوت کی گونج تھی، فائلوں پر دستخطوں کی قیمت لگتی تھی، اور فیصلے ضمیر سے نہیں، زر سے کیے جاتے تھے۔

مجھے وہ دن یاد ہے جب وہ ایک دیہاتی وفد سے ملا۔ غربت، لاچاری اور بھوک ان کے چہروں پر لکھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اپنے بچوں کے تعلیمی اخراجات، پینے کے پانی، اور اسکول کی حالت زار پر سوالات کیے۔ وہ مسکرایا، ان کے

کندھے پر ہاتھ رکھا، وعدے کیے... اور جب وہ چلے گئے، تو ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا:

گندے لوگ، کوٹ کو بدبودار کر دیا۔

میں اُس لمحے شرمندہ ہوا۔ میں چاہتا کہ اپنے بٹن خود توڑ دوں، کہ وہ ہاتھ مجھ پر نہ لگے۔ مگر میں مجبور تھا— کوٹ تھا— ایک خاموش شاہد، جو صرف دیکھ سکتا ہے، مگر بول نہیں سکتا۔

راتوں کو جب وہ خفیہ محفلوں میں جاتا، تو میں اس کے ساتھ ہوتا۔ شراب، سازش، ساز، اور سودے— میں ان سب کا گواہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کون سا صنعت کار کون سا منصوبہ خرید رہا ہے، کون سا ایم این اے ضمیر بیچ رہا ہے، اور کون سا سفیر جھوٹ کے لفافے میں سودے کی رسید چھپا رہا ہے۔

ایسے میں مجھے لگتا، جیسے میں کسی مردہ ضمیر پر کفن ہوں— چمکتا، مگر اندر سے سڑا ہوا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب اُس کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ عوام کے صبر کا پیمانہ چھلکنے لگا۔ عدالتوں میں اس کے خلاف درخواستیں داخل ہوئیں، اس کے وزیر بھاگنے لگے، اور اخباروں میں اس کی تصویر کے نیچے "بدعنوان" کے الفاظ چھپنے لگے۔

آخر کار، اقتدار کا دیوتا دھڑام سے گر پڑا۔

گرفتاری کا حکم ہوا۔

وہ جس کار میں بیٹھ کر کبھی قافلے کی قیادت کرتا تھا، اب اسی میں ہتھکڑیوں میں بیٹھا تھا۔

میرے وجود پر پہلی بار دھند چھا گئی— جیسے میں بھی رسوا ہو گیا ہوں۔

پولیس نے اس کے گھر کی ہر چیز ضبط کر لی۔ خزانے، زیور، فائلیں، حتیٰ کہ وہ میز بھی جس پر وہ فیصلے کرتا تھا— سب کچھ۔

اور میں...؟

میں ایک پرانے صوفے کے ساتھ لٹکا رہ گیا— جیسے کوئی بادشاہت کا آخری پرچم۔

اس کے پرانے مالی نے مجھے چرا لیا۔ نہ عشق میں، نہ وفا میں— بس ضرورت میں۔

اس نے مجھے ایک پرانی اشیاء کے بازار میں بیچ دیا، جیسے کوئی بزرگ اپنے ورثے کے خطوط کو کباڑیے کے حوالے کر دے۔

وہاں، گندگی، دھول اور وقت کے ساتھ مٹی ہوئی اشیاء کے درمیان، میں ایک گوشے میں لٹک گیا۔

اور پھر ایک دن، ایک نحیف سا استاد آیا۔

اس نے مجھے دیکھا، چھوا، آنکھوں میں کچھ سوچا، اور خرید لیا۔

گھر جا کر اپنی بیوی سے کہا:

"یہ میرے شاگرد کا تحفہ ہے۔ آج ایک بڑی یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہے، میری بہت عزت کرتا ہے"...

وہ دن، جب میں اُس استاد کے جسم پر آیا، میرے لیے ایک عجیب تبدیلی کا لمحہ تھا۔

نہ اب رعب کے ہالے تھے، نہ جھوٹی مسکراہٹوں کے سائے۔

نہ سازشوں کی مہک تھی، نہ سازشوں کی مہنگی خوشبو۔

اب میں ایک ایسے انسان کے تن پر تھا جس کی روح زخمی تھی اور جسم پوشاک کا محتاج۔

استاد...

ایک چھوٹے کالج میں پڑھانے والا، جس کی جیب میں تنخواہ سے زیادہ تمنائیں تھیں، اور دل میں علم سے زیادہ بیقدری کے زخم۔

اس نے مجھے یوں اوڑھا جیسے کوئی مفلس شاعر پرانی چادر میں بھی سکندری ڈھونڈتا ہے۔

جب وہ کلاس میں جاتا، تو میں اس کے وجود پر ایک دعویٰ بن جاتا:

"دیکھو، میں بھی کسی بڑے شاگرد کی محبت ہوں"...

مگر سچ تو یہ تھا کہ میں ایک جھوٹ کا پردہ بن چکا تھا — وہ جھوٹ جو وہ اپنی بیوی، بچوں، شاگردوں، اور خود سے بولتا رہتا۔

استاد کی زندگی علم کے ستونوں پر کھڑی تھی، مگر اس کی چھت میں عزت کا سوراخ تھا، جہاں سے مسلسل بیقدری کی بارش ٹپکتی رہتی۔

کالج کے کوریڈور میں جب وہ چلتا، تو اس کے قدموں کے نیچے صرف چال نہ ہوتی، بلکہ ایک پوری صدی کی تھکن ہوتی۔

اس کے شاگرد اب بیرونِ ملک تھے، کاریں، کوٹھیاں، تنخواہیں — سب کچھ تھا، مگر اس کے پاس؟

صرف ایک کوٹ... اور یادیں۔

گھر میں وہ ایک اجنبی کی طرح رہتا۔

بیوی اس کی خاموشی کو کمزوری سمجھتی،

بیٹے اس کی سادگی کو شرمندگی،

اور بیٹیاں اس کے خوابوں کو اپنی فیسوں کی راہ کی رکاوٹ۔

میں کئی بار اس کے وجود سے پھسلتا،

کبھی اس کے بڑے بیٹے کے جسم پر آجاتا،

جو دوستوں میں جا کر کہتا:

یہ میرے ماموں نے لے کے دیا ہے، وہ بہت بڑے افسر ہیں۔

اور پھر زور سے ہنستا، جیسے سچ کا گلا گھونٹ رہا ہو۔

کبھی چھوٹا بیٹا، جو طالب علم تھا مگر دل سے باغی، مجھے کالج میں پہنتا۔

کچھ لڑکیاں دیکھ کر کہتیں:

" کتنا عجیب سا کوٹ ہے"...

اور وہ کندھے جھاڑ کر کہتا:

"فیشن ہے، تمہیں کیا پتا؟"

میں ان باتوں پر سسکتا، مگر کیا کرتا؟

میں تو خود بھی وہی تھا جو اب دکھتا نہ تھا۔

میرے اندر اب بھی اون کے نرم ذرات تھے، مگر وہ اب بوسیدہ ہو چکے تھے۔

میری سلائیاں کمزور ہو چکی تھیں، بٹن ڈھیلے پڑ چکے تھے، اور اندر کی استر کٹی پھٹی تھی۔

ایک دن استاد اپنی علم کی دنیا سے تھک کر آیا۔

اس نے مجھے اتارا، میرے پرانے بٹنوں کو سہلایا، اور آہ بھری۔

اور پھر ایک دن...

ایک فقیر دروازے پر آیا۔

چہرہ جُھلسا ہوا، داڑھی الجھی، اور پیچھے ایک چھوٹا لڑکا۔
استاد نے مجھے اتارا، لپیٹا، اور فقیر کے ہاتھ میں تھما دیا۔
"سردی ہے، یہ پہن لینا"...
میں سمجھ گیا—
یہ میرا آخری زینہ ہے، مگر شاید کہانی ابھی باقی ہے۔
جب اس فقیر نے مجھے پہنا تو میرے اندر ایک سرد لہر دوڑ گئی—
نہ یہ سردی تھی، نہ رنج، بلکہ ایک ایسی بینظیر بیبسی جو ہر رگ میں ٹوٹ کر اتر گئی۔
اس فقیر کا جسم کپکپا تا نہ تھا، مگر دل کسی احساس سے خالی تھا۔
وہ نہ پچھلی زندگی کے دکھ سے بوجھل تھا، نہ آنے والے کل کی امید سے وابستہ تھا بلکہ وہ ایک ایسی نسل سے تھا جس نے صدقے کو روزی، اور ذلت کو فخر کا لباس بنا رکھا تھا۔
اس کا باپ سڑک کنارے مر گیا تھا اور ماں بھی گلی کے کونے میں سسکتے سسکتے مٹی میں مل گئی—
اور وہ... وہ بازاروں میں مانگنے کے فن کو آبائی وراثت سمجھتا تھا۔
جب وہ صبح نکلتا، تو مجھے جھاڑ کر پہنتا تو نہ کسی آئینے میں دیکھتا، نہ کوئی گلہ، نہ شکایت۔اس کی نظریں ہر گزرتے راہگیر کی جیبوں میں جھانکتی تھیں، اور اس کی زبان پر ہمیشہ وہی مدھم سی "دعائیں" ہوتی تھیں جن میں دعاؤں سے زیادہ التجا اور خلوص سے زیادہ اداکاری ہوتی۔
میں اس کے تن پر تھا، مگر اب میں کپڑا نہیں رہا تھا ایک سائے کی مانند، جو کسی ذلت کی کالی لکیر میں تبدیل ہو چکا تھا۔میرے دھاگے کھل چکے تھے، کنارے پھٹنے لگے تھے، اور میرے بٹن ایسے تھے جیسے کسی بزرگ کی آنکھیں، جو نہ کچھ دیکھ سکتی تھیں، نہ روک سکتی تھیں۔
بازار کی ہر گلی میں میرا لمس زمین پر رگڑ کھاتا۔جب وہ کسی چوراہے پر بیٹھتا تو میں اس کے گرد لپٹا رہتا جیسے کوئی خستہ حال قبر پر پڑی مٹی کی میلی چادر۔
ایک دن ایک ننھے بچے نے میری آستین پکڑی جس کی آنکھوں میں بھوک کا خواب تھا۔فقیر نے میری آستین جھٹک دی اور میں توازن کھو کر اس کی گود میں گر پڑا۔میں، جو کسی زمانے میں اقتدار کے ایوانوں میں فخر سے جھولتا تھا اب ایک

بھوکے بچے کے ہاتھوں میں بیوزن ہو چکا تھا۔

میرے دن، کوڑے کی بو، چوک کی گرد، بارش کے پانی، اور دھوپ کی جھلس میں گزرتے۔ ہر نیا دن میری بربادی کی نئی داستان بناتا۔ میں کبھی اس فقیر کے گندے بستر پر پڑا ہوتا کبھی نالے کے کنارے، کبھی کسی سگریٹ والے کے قریب، جہاں لوگ ہنستے، قہقہے لگاتے، اور میرے پھٹے کناروں پر طنز بھری نظروں سے گزرتے۔

اور پھر... وہ دن آیا جب میرے بدن میں دھاگے بھی سانس لینا چھوڑ گئے۔ فقیر نے مجھے دیکھا، تھوڑی دیر سوچا، پھر ایک لمبی آہ بھر کر مجھے جھاڑ کر اپنے ہاتھوں سے لپیٹا اور ایک تھیلے میں ڈال دیا۔ اُسی شہر کے مضافات میں، جہاں میرا آغاز ہوا تھا۔ جہاں ہر بیکار، ہر ٹوٹا، ہر مسترد چیز کو ٹھکانہ ملتا ہے۔ وہیں ایک عظیم کوڑے کے ڈھیر پر مجھے آخری بار پھینک دیا گیا۔

یہ وہی جگہ تھی جہاں سے میری کہانی کی تمہید شروع ہوئی تھی۔ اب میں نہ کوٹ ہوں، نہ لباس، نہ فیشن، نہ فخر۔ اب میں صرف ایک بینام دھاگہ ہوں، جو وقت کی کتب میں ایک بیصد اصفحہ بن چکا ہے۔ لیکن میرے اندر... آج بھی سب کچھ محفوظ ہے۔ جاگیردار کا ریوڑ، کارخانے کا دھواں، سیاست دان کی سازشیں، استاد کی خاموشیاں، اور فقیر کی پکار... سب کچھ۔

میں کچرے کے اس ڈھیر پر پڑا ہوں، مگر میری خاموشی میں صدیوں کی گونج ہے، میرے چیتھڑوں میں ہزاروں خوابوں کی چیپ ہے۔ کوئی دیکھے تو سہی، کوئی سنے تو سہی، کہ میں ایک اوورکوٹ ہوں، جس نے انسانوں کی تہذیب کو اپنے جسم پر برتا ہے۔

ایک کتاب کی آپ بیتی

میں ایک کتاب ہوں یا تھی۔ بوری میں بند، مٹی کی خوشبو اور نمی سے لبریز اس کمرے میں پڑی ہوں جو مسجد کے پہلو میں ہے۔ دیواریں خاموش ہیں، مگر ان کے سینوں میں جانے کتنی سسکیاں دفن ہیں۔ یہاں وہ سب کچھ آ کر ٹھہر جاتا ہے جسے وقت بھول جاتا ہے — پھٹے ہوئے مقدس اوراق، جلتی دعائیں، آنسوؤں میں بھیگے ہوئے رسائل، اور میں... ایک شاعری کی کتاب، جس کے ورق پر کبھی خواب اترتے تھے، اب مٹی کے ذروں سے ہم آغوش ہو رہے ہیں۔

میں کفن کے ساتھیوں میں شامل کر لی گئی ہوں۔ بوری میری قبر ہے اور اس کمرے کی خاموشی میرا ماضی۔ کہتے ہیں کہ جو چیز مقدس ہو جائے، وہ بے وقعت نہیں ہوتی، صرف فنا کی دہلیز پر سجدہ کرتی ہے۔ میری تحریریں شاید اب کسی آنکھ کو نہ بھائیں، مگر وہ دن بھی تھے جب لفظ میرے دامن میں گلابوں کی طرح کھلتے تھے۔

اب جب کوئی مر جائے گا، تو میں اس کے ساتھ دفن ہو جاؤں گی۔ شاید کسی مٹی کی گود میں پڑی پڑی، میرا کوئی لفظ کسی کی روح کو سہارا دے۔ میری سانسیں مدھم ہو چکی ہیں، مگر میری یادیں ابھی باقی ہیں۔

میں اپنے سفرِ حیات کی داستان سنانا چاہتی ہوں۔ مگر سننے والا تو کوئی ہو۔ کیا تم سنو گے؟ تم جو ان لفظوں کو چھو رہے ہو،

تمہیں سنائی دے رہا ہے نا؟
یہ کہانی میری پیدائش سے پہلے کی ہے... جب میں نرم لکڑی کا پوداتھی، اور جنگل میرا وطن تھا۔
ایک سبز لکڑی کا شاخچہ، جو گھنے جنگل کی چھاؤں میں سانس لیتا تھا۔ میرے اردگرد سرسبز درختوں کی قطاریں تھیں— چنار، شہتوت، صنوبر، کیکر، ببول — جیسے سبز صحیفے کے اوراق میں خدا کے اسماء جا بجا بکھرے ہوں۔ میں بھی انہی مقدس حروف کا ایک حرف تھی، بیخبر، معصوم، دھوپ سے نا آشنا۔
میرے اوپر پرندوں کے نغمے گرتے تھے۔ کوئل کے بول میرے تن پر شبنم کی طرح ٹپکتے، اور بلبل کی لَے مجھے مدہوش کر دیتی۔ ہوا جب سرسراتی، تو میری شاخوں میں ساز بجتے۔ میں اپنے آپ کو کسی ماہر سازندے کے زیرِ اثر محسوس کرتی، جو ہر جھونکے کے ساتھ نئی دُھن چھیڑتا ہے۔
جنگل کوئی عام جگہ نہیں تھی۔ وہ تو جیسے کوئی جیتی جاگتی کائنات تھی، جس کے ہر درخت کے سینے میں ایک الگ داستاں تھی۔ جڑوں کی زیرِ زمین گفتگو، پتوں کی ہنسی، پھولوں کی مسکراہٹیں، اور ہر شجر کی اپنی انا... میں اُن میں چھپی ایک نادیدہ دعا تھی، ایک بینام تمنا۔
مگر پھر ایک دن کچھ اجنبی آوازیں آئیں۔ دھات کی، دھوئیں کی، اور انسان کی آوازیں۔ پہلے پہل لگا جیسے کوئی طوفان جنگل میں اترا ہو، مگر وہ طوفان نہیں تھا، وہ تو انسانی ترقی کا قاصد تھا، جو فطرت کے بوسیدہ پیراہن کو کاٹنے آیا تھا۔
گاڑیاں آئیں، کلہاڑیاں لہرائیں، مشینوں کی گرج نے پرندوں کی آوازوں کو نگل لیا۔ میں کانپ گئی۔ میرے آس پاس کے پیڑ یکا یک زمین پر گرتے گئے، جیسے کوئی دراز قامت فقیر سجدے میں گر رہا ہو۔ صنوبر کی چیخ سنائی دی، ببول کا سینہ چرایا گیا، اور پھر... میری باری آ گئی۔
کلہاڑی کا پہلا وار میرے جسم پر نہیں، میرے احساس پر پڑا۔ میں ٹوٹنے سے پہلے ہزاروں برس کا دکھ سہہ گئی۔ وہ لمحہ... جب میں زمین سے الگ ہوئی، میرے جڑوں نے آخری بار مٹی کو پکارا، اور ہوا نے مجھے الوداع کہا۔
مجھے ٹرک میں پھینک دیا گیا۔ میرے جیسے درجنوں کٹے ہوئے تن بیسہارا پڑے تھے۔ سب کے چہرے پر خاک اور زوال کی ایک تہہ جمی ہوئی تھی۔ ٹرک دھیرے دھیرے جنگل کو چھوڑ گیا۔ ہریالی پیچھے رہ گئی، اور گرد آلود سڑکوں کا سفر شروع ہوا۔
راستے میں درختوں کے سائے اب بھی میرے ساتھ چل رہے تھے، جیسے کوئی پرانا دوست رخصت کے وقت ہاتھ ہلا رہا

ہو۔ میں اب کوئی جاندار لکڑی نہیں تھی، بلکہ ایک خاموش شے، جس کا مقدر انسان کے دستر خوان پر بچھنا تھا، یا شاید کسی چولہے میں جلنا۔

لیکن نہیں، میرا نصیب کچھ اور تھا۔ میں آگ میں نہیں جلی، نہ ہی چارپائی بنی۔ میں ایک ایسی کارخانے کے دروازے پر پہنچی، جہاں خواب کچلے جاتے تھے، اور پھر انہی کچلے ہوئے خوابوں سے صفحات بنائے جاتے تھے۔

مجھے ایک بڑے دروازے سے اندر دھکیلا گیا۔ باہر کی دنیا کا شور پیچھے رہ گیا، اور ایک نئی کائنات میرے استقبال کو تیار کھڑی تھی — کارخانہ۔ یہاں ہر شے رواں تھی، مشینیں، دھواں، آوازیں، اور انسانی ہاتھ، جو خاموشی سے اپنے حصے کا کام انجام دیتے تھے۔ میں حیرت سے سب کچھ دیکھتی رہی۔ وہ سب جو کبھی درخت تھے، جن کے تن پر بلبل گاتی تھی، جن کے سائے میں ہرن ٹھہرتے تھے، اب یہاں بیجان گٹھڑیوں میں لپٹے ہوئے، اپنی شناخت کھو بیٹھے تھے۔

مجھے بھی اندر لے جایا گیا، اور میرے جسم کو چیر پھاڑ کر الگ الگ حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ سب سے پہلے میرے چھال کو الگ کیا گیا۔ وہی چھال جو کبھی بارشوں سے بھیگی تھی، جس پر کبھی تتلیاں بیٹھی تھیں، اب ایک سنجیدہ مزدور کے ہاتھ میں قینچی کی طرح کٹ گئی۔ پھر مجھے بھٹی کی آغوش میں جھونک دیا گیا۔ وہ آگ، جس کی حدّت نے میرے اندر کے تمام نغمے جلا دیے، اور مجھے ایک بےحس گودے میں تبدیل کر دیا۔

میں چیخنا چاہتی تھی، مگر میرے ہونٹ تو کبھی تھے ہی نہیں۔ میں خاموشی سے جلتی رہی، پگھلتی رہی، اور اپنے اندر کی ہریالی کو راکھ بنتے دیکھتی رہی۔

کارخانے کی دیواروں کے اندر کچھ انسان بھی تھے — کچھ بوڑھے مزدور، جن کی آنکھوں میں نیند اور تھکن کا امتزاج تھا، کچھ نوجوان، جو آنے والے کل سے بیخبر مشینوں کے شور میں گم تھے۔ ان میں ایک شخص "بابا خدا بخش" تھا۔ چھوٹے قد کا، پتلا دبلا، آنکھوں میں عجب سی مایوسی، مگر چہرے پر ضبط کی جمی ہوئی تہہ۔ وہ جب گودے کو چھانتا، تو اس کی انگلیوں کی نرمی مجھے پھر سے فطرت کی آغوش میں لے جاتی۔ جیسے وہ کہتا ہو: " گھبرا نہیں، تو اب کتاب بنے گی، اور پھر تیرا حرف کسی دل میں گھر کرے گا۔"

ایک اور شخص "رضوان" تھا۔ نوعمر، ہنس مکھ، مگر بکھرے ہوئے خوابوں کے ساتھ۔ وہ کبھی کبھار چھانتے ہوئے کاغذ کے ٹکڑوں سے تصویریں بناتا، اور ہنستا کہ جیسے وہ ان ٹکڑوں میں کہانی تلاش رہا ہو۔ ایک بار اس نے میری ایک لکڑی کے ذرّے کو انگلی پر رکھ کر کہا:

"شاید یہ کسی ایسے درخت کا حصہ ہو، جس پر کوئی عاشق کبھی اپنی محبوبہ کا نام کندہ کر گیا ہو۔"

مجھے حیرت ہوئی، کسی نے مجھے "محبوب" کہا تھا۔

اس کے بعد مجھے ایک بڑے حوض میں ڈال دیا گیا، جہاں پانی، ادویات، اور مشینوں کا جادو مجھ پر چلا۔ میرے اجزاء تحلیل ہونے لگے، اور میں رفتہ رفتہ ایک سفید ملغوبے میں بدل گئی۔ وہی ملغوبہ جو بعد میں کاغذ کی شکل اختیار کرے گا۔

اس کارخانے کی مشینیں کچھ ایسی تھیں جیسے وقت کے دیو نے خود بنائی ہوں۔ گارے کو پھیلانے والی مشین، خشک کرنے والی مشین، دبانے والی مشین—ہر ایک مشین بیرحم، مگر خلاق۔ میرا وجود ان کے بیچ گُم ہوتا گیا، اور پھر ایک دن، میں سفید، نازک، نرم و ملائم کاغذ کی صورت سامنے آئی۔

میرے وجود میں اب نہ لکڑی کی کھردراپن تھا، نہ درخت کی جڑوں کی سچائیاں۔ میں ایک صفحہ تھی، جس پر کچھ بھی لکھا جا سکتا تھا۔ تقدیر کے فیصلے، شاعری کے نغمے، طبیعیات کے کلیے، یا محبت کے خط۔

میری سفید پیشانی پر ابھی کچھ نہیں لکھا گیا تھا، مگر میں جانتی تھی کہ وقت مجھے لفظوں سے بھر دے گا۔

مجھے باقی ساتھیوں کے ساتھ گٹھڑیوں میں باندھ کر ایک بڑے ٹرک میں ڈال دیا گیا۔ یہ سفر شہر کی طرف تھا۔ وہاں کے کاغذ بازار، جن کی گلیاں وقت کی کتب بینی کا مرقع تھیں، ہمارا منتظر تھیں۔

گاڑی کی لرزش میں، میں نے سوچا...

کیا مجھے کوئی عاشق خریدے گا، جو میری جلد پر اپنی محبوبہ کے لیے نظم لکھے گا؟

یا کوئی استاد، جو مجھے طلبا کے ہاتھوں میں دے گا؟

یا کوئی ناشر، جو مجھے کسی شاعر کی کتاب بنائے گا؟

میرے سامنے امکانات کی بساط وسیع تھی۔

میں اب کاغذ کی صورت میں تھی—خالص، سفید، صاف ستھری، مگر خاموش۔ میری پیشانی پر ابھی تک کوئی حرف نہیں اترا تھا۔ مجھے اُس شہر کی طرف روانہ کیا گیا جس کی گلیوں میں اردو کی خوشبو بستی تھی، جہاں دواتوں کی مہک فضا کو مہذب بناتی، اور چھاپہ خانوں کی دھمک میں قلم کی دھڑکن سنائی دیتی تھی۔

ہم کاغذوں کی گٹھڑی کو جب ایک نسبتاً چھوٹی مگر پر جوش اشاعتی ادارے کے دروازے پر اتارا گیا، تو ہمیں احساس ہوا کہ ہم کسی نئے جنم کی دہلیز پر کھڑے ہیں۔

یہاں میری تقدیر سے ملاقات ہونے والی تھی۔اور میری تقدیر کا نام تھا: "محسن رضوی"۔

محسن رضوی — ایک غیر معروف شاعر، جو اپنی تخلیقات میں خود کو غالب، اقبال، میر، اور مجید امجد کا نادر امتزاج سمجھتا تھا، مگر دنیا ابھی تک اُس کی ایک بھی کتاب کو قابلِ توجہ نہ سمجھتی تھی۔اس کی آنکھوں میں خواب تھے، مگر حقیقت سے بہت دور۔وہ نوکری کے بعد کمرے میں بیٹھ کر شمع کی روشنی میں اشعار لکھتا، اور جب اپنا کلام پڑھتا، تو ایسا محسوس ہوتا جیسے کسی مجروح پرندے نے بلند پرواز کا ارادہ کر لیا ہو۔

اشاعت کے دفتر میں جب وہ داخل ہوا، تو جیسے ایک دیوانہ خانہ ادب کے در پر دستک دے رہا ہو۔اس کے ہاتھ میں چمڑے کی ایک پرانی فائل تھی، جس میں اس کا قلمی مجموعہ "سفرِ خیال" بند تھا۔

اشاعت کا عمل شروع ہوا — سب سے پہلے کتابت کا مرحلہ آیا۔

میرے اوپر پہلا حرف اترا، کسی ماہر خطاط کے قلم سے۔وہ قلم جو لفظوں کو زیور کی طرح سنوارتا تھا، وہ انگلیاں جنہوں نے آیات کو کاغذ پر بسایا، اب میری پیشانی پر شعر لکھ رہی تھیں۔

"دھندلے خوابوں کے دامن میں،

اک سچائی چھپی ہوتی ہے"...

میں کانپ گئی۔میرا پہلا شعر! میں اب کاغذ نہ رہی، میں کتاب بننے لگی۔

اس کے بعد پلیٹ سازی کا عمل ہوا۔وہ دھات کی چادر، جس پر ہر صفحہ کندہ کیا گیا۔میں ان تصویروں کو دیکھتی رہی جو میرے جسم پر ثبت ہونے والی تھیں۔ہر حرف، ہر وقفہ، ہر نقطہ... جیسے تقدیر کا قلم میرے ماتھے پر اپنی تحریر لکھ رہا ہو۔

پھر چھاپ کی مشینیں گرجنے لگیں۔سیاہی میری روح میں اتری، اور میں لفظوں سے بھر گئی۔میرا جسم اب اشعار کا بوجھ اٹھا رہا تھا، ایک بوجھ جو نغمہ بھی تھا اور نوحہ بھی۔پھر کٹائی، ترتیب، سائزنگ، اور آخر میں جلد بندی۔

میری جلد نیلی تھی، عنوان سنہری۔

"سفرِ خیال" — از محسن رضوی

نیچے ایک مختصر تعارف: "اردو شاعری کا نیا سورج، ایک منفرد آواز"

محسن رضوی خود یہ سطر لکھ کر ہنسا تھا، اور بولا:

"اب دیکھنا، دنیا کیسے جھومے گی میرے اشعار پر"!

مجھے اشاعت کے بعد پہلی بار اُس کے ہاتھوں میں اٹھایا گیا۔ اُس کی نظریں میری جلد کو نہیں، میرے اندر کے حرفوں کو چاٹ رہی تھیں۔ اُس نے اپنا ہی شعر پڑھا، اور خود ہی واہ واہ کی۔

" دل کی دیوار پہ دستک دی ہے وقت نے،

اور میں نے کہا، ابھی کچھ لمحے خوابوں میں رہنے دو۔ "

مگر بازار میں میری پذیرائی نہ ہوئی۔ کتاب فروش نے مجھے اپنے اسٹال کے پچھلے کونے میں رکھا، جہاں دھوپ کم آتی تھی، اور گرد زیادہ۔ دو چار تعارفی نسخے بانٹے گئے، کچھ دوستوں نے زبانی تعریف کی، مگر حقیقت میں کوئی قاری نہ آیا۔

محسن رضوی کے چہرے پر مایوسی اُتری، مگر غرور پھر بھی باقی رہا۔ وہ کہتا:

" مجھے وقت سے پہلے سمجھا جا رہا ہے۔ کل یہ کتاب ادب کی کلاسیک ہوگی۔ "

میں اس کی خاموش خواہشوں کی ہمراز تھی۔ ہر ورق پر اُس کی خود فریبی کی مہک تھی۔

میں اُس کے ہاتھوں میں چند دن رہی، پھر ایک بڑے آدمی کے ہاتھ بیچ دی گئی، جو " ظاہر داری " کا مریض تھا۔

وہ شخص " نذیر احمد " تھا — نہ تو شاعر، نہ قاری، اور نہ ہی کسی علم کی پیاس سے آشنا۔ وہ نئے دولت مندوں میں سے تھا، جن کے لیے کتابیں محض شان و شوکت کا جزو ہیں، ایک ایسا زیور جو دیواروں کی زینت بنتا ہے، مگر دلوں کو چھو نہیں پاتا۔

اس کے کتب خانے میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنی جگہ دیکھی — ایک چمک دار شیشے دار الماری کی درمیانی تہہ میں، جہاں میرے اردگرد فلسفے، نفسیات، تصوف، سائنس، اور مذہب کی کتابیں رکھی گئی تھیں۔ میری جلد نیلی تھی، سنہری عنوان کسی زخم پر رکھے زعفران کی مانند چمکتا تھا، اور میں باقی کتابوں کے درمیان خود کو کسی تاجدار کی بیوی کی طرح محسوس کرتی تھی — محترم، مگر تنہا۔

میرے ساتھ " وجود و شعور "، " کشف المحجوب "، " حیاتِ جاوید "، اور " فزکس آف دی سول " جیسی کتابیں تھیں، مگر افسوس، یہاں کسی نے ہمیں پڑھنے کے لیے نہیں چھوا۔ ہم صرف نمائش کا حصہ تھے، دیوار پر لٹکی ہوئی پینٹنگز کی مانند، جن کی آنکھوں میں رنگ ہوتے ہیں، مگر لب خاموش۔

نذیر احمد کے ہاں جب مہمان آتے، تو وہ اپنی لائبریری کا دروازہ کھول کر فخر سے کہتے:

" یہ سب میری ذاتی کلیکشن ہے... ادب، فلسفہ، سائنس... سب کچھ "!

مہمان واہ واہ کرتے، اور کوئی نہ پوچھتا کہ ان میں سے کیا پڑھا ہے۔

وقت گزرتا گیا۔ کتب خانے کا دور ختم ہو رہا تھا۔ اب نذیر احمد کا شوق "مصوری" کی طرف مائل ہونے لگا۔ اُس نے ایک فنکار کو بلایا، جو دیواروں پر جدید آرٹ کے "علامتیت" کو رنگوں میں ڈھالتا تھا۔ اُس نے کہا:

"یہ پرانی کتابیں ہٹا دو، اب جگہ تصویروں کی ہے۔"

ملازموں کو حکم ملا:

"یہ سب کتابیں نکال دو۔ بیچ دو، دے دو، یا جہاں جی چاہے پھینک دو۔"

ایک دن، وہی ملازم آیا۔ اُس کے ہاتھوں میں بےحسی تھی، اور آنکھوں میں حکم کی تعمیل۔ اُس نے مجھے دیگر کتابوں سمیت ایک پرانی ریڑھی پر ڈالا۔ میں نے آخری بار اپنی الماری کو دیکھا، اُس دھول بھرے شیشے کو، جس نے مجھے قید رکھا تھا، مگر مجھے عزت دی تھی۔

اب میں "اردو بازار" کے اُس حصے میں آ چکی تھی جہاں کتابیں تول کر بیچی جاتی ہیں، جیسے سبزی، جیسے ردی کا غذات۔ میری جلد کا سنہری رنگ اب دھندلا گیا تھا، میرا عنوان مٹنے لگا تھا، اور میری خوشبو... ہاں، میری وہ خاص خوشبو جو خطاطی کی سیاہی، شاعر

کے لمس، اور کارخانے کے کرب سے ملی تھی، اب گرد و غبار میں دب گئی تھی۔

وہاں ایک پرانی دکان تھی "کتاب خانہ متروکہ خیالات"، جہاں میں دیگر پرانی کتابوں کے درمیان بینام پڑی تھی۔ کچھ میرے ساتھ وہ بھی تھیں جو مدرسوں کے نصاب سے نکال دی گئیں، کچھ وہ تھیں جن کے مصنف مر چکے تھے، اور کچھ وہ جو کبھی کسی دل کی دھڑکن تھیں، اب محض خاموش سانسیں۔

یہاں نہ کوئی قاری آیا، نہ کوئی عاشق۔ وقت گزرتا رہا۔ میں صفحات میں سسکیاں دباتی رہی۔ پھر ایک دن، کسی نے مجھے خرید لیا۔

نہ تو کوئی استاد، نہ دانشور، نہ طالب علم... بلکہ ایک لڑکی، ایک خوابیدہ آنکھوں والی لڑکی، جو شاید خود بھی کسی شعر کا ادھورا مصرع تھی۔

وہ دن ابھی بھی میرے یادداشت کے زرد صفحے پر جگمگا رہا ہے — جب وہ آئی۔ وہ، جس کی آنکھوں میں خوابوں کا رنگ، لفظوں کا غرور اور خیالوں کا شور بسا ہوا تھا۔ وہ نہ کوئی عالم تھی، نہ نقاد، نہ ہی کسی بڑی درسگاہ کی ممتاز طالبہ، مگر اُس کے لمس میں خوابوں کی نمی تھی۔ اُس نے مجھے بوسیدہ کتابوں کے ڈھیر سے یوں اٹھایا جیسے کوئی بچھڑا ہوا خواب مل گیا ہو۔

اس کا نام شاید سلمیٰ تھا، یا شازیہ، یا پروین... میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی، کیونکہ اس نے میرے صفحات پر اپنا نام نہیں لکھا، مگر وہ جو بھی تھی، میری ورق ورق پہ اتر گئی۔

وہ ایک چھوٹے سے گاؤں سے آئی تھی، جہاں صبحیں محنت کی، دوپہریں خاموشی کی، اور راتیں خوابوں کی قیدی ہوتی ہیں۔ وہ روزانہ قریبی شہر کے کالج جاتی، گرد آلود بسوں، دھول بھرے رستوں اور سستے بستوں کے ساتھ۔ اُس کی دنیا میں تعلیم محض سند نہیں تھی، بلکہ بغاوت تھی، احتساب تھا، شناخت کی تلاش تھی۔ مگر اس کا دل، اس کا دل تو کسی اور ہی دنیا میں آباد تھا۔

وہ مجھے لے گئی—اپنے چھوٹے سے کمرے میں، جہاں ایک میز، دو کرسیاں، اور بے ترتیب خوابوں سے بھرے دیواروں پر چند شاعروں اور فنکاروں کی سیاہ و سفید تصویریں لٹک رہی تھیں۔ غالب، ساحر، احمد فراز، مرزا ہادی رسوا... اور ایک دو فلمی ہیرو، جو اس کے دل کی تنہائی میں رنگ بھرتے تھے۔

میرے اوراق کو اُس نے محبت سے چھوا۔ میرے اشعار کو زیرِ لب دہرایا، جیسے کوئی عاشق معشوق کی باتیں دہراتا ہے۔

وہ ان شعروں میں خود کو تلاش کرتی، اور کبھی خود کو ان شعروں میں گم کر دیتی۔

اکثر وہ مجھ پر جھک کر لکھنے کی کوشش بھی کرتی—خود کی نظمیں، ادھورے خیالات، ناپختہ خواب—

"تیری یاد کا رنگ ہونٹوں پہ لاؤں
خود کو تیری ذات میں کھو جاؤں"...

یہ اشعار میری پشت پر جیسے زخم بن کر اترتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ وہ ابھی شاعری کی روح کو نہیں سمجھتی، مگر میں اُس کے جذبے کی سچائی کو سلام کرتی۔

وہ اکثر آئینے کے سامنے بیٹھ کر خود کو مشہور شاعرہ تصور کرتی۔ بڑے مشاعروں کی رونق، داد کی گونج، سامعین کی نظریں—سب اس کی
آنکھوں میں بسے تھے، مگر باہر کی دنیا میں وہ بس ایک عام سی لڑکی تھی، جس کی ماں اُس کے خوابوں سے نالاں تھی۔

ماں—ایک درمیانی عمر کی تھکی ہوئی عورت، جس کے چہرے پر معاشی تنگی، سماجی دباؤ، اور گھریلو مایوسی کے نشان تھے۔ اُسے بیٹی کی شاعری، تصویروں، اور خوابوں سے سخت چڑ تھی۔

"یہ سب فضولیات ہیں، نہ روٹی دیتی ہیں نہ عزت۔ نہ ہم تمھارے باپ کے مرثیے لکھنے والے ہیں، نہ کوئی رسالے

والے تجھے چھاپیں گے۔"

اور پھر وہ دن آیا...

ایک سہ پہر، جب وہ لڑکی کالج گئی ہوئی تھی، ماں نے اُس کے کمرے کی صفائی کرتے ہوئے جھاڑن ہاتھ میں لیا، اور میرے ساتھ چند رومانوی ڈائجسٹ، ادھ موئی تصویریں، اور ایک ادھورا کاپی — سب کو جمع کیا اور ایک خالی آٹے کی بوری میں پھینک دیا۔

"ختم کرو یہ بکواس، گھر کو کباڑ خانہ بنا رکھا ہے"!

مجھے زمین پر پھینکا گیا۔ میں نے پہلی بار خود کو یتیم محسوس کیا۔ وہ ہاتھ، جنہوں نے مجھے محبت سے چھوا تھا، آج غائب تھے، اور وہ آنکھیں، جنہوں نے مجھے تعبیر کی نگاہوں سے دیکھا تھا، اب میرے ساتھ نہ تھیں۔

میں بوری میں پڑی تھی، دیگر بیکار اشیاء کے ساتھ۔ وہ لمحے میرے لیے قیامت تھے۔

پھر بوری اٹھائی گئی اور گلی کے کچرے دان میں پھینک دی گئی۔

بارش شروع ہو گئی تھی۔

پہلا قطرہ میرے سر پر گرا۔

پھر دوسرا، پھر تیسرا...

میں بھیگ گئی۔ میرے ورق، جو کبھی کسی کے دل کی دھڑکن ہوا کرتے تھے، اب بارش کے قطروں سے سوج گئے۔

سیاہی بہنے لگی، الفاظ دھندلانے لگے، اور میں... میں اپنا چہرہ کھو بیٹھی۔

پھر اگلی صبح، مسجد کے خادم نے یہ بوری اُٹھائی۔

"پھٹے پرانے مقدس اوراق، پرانے رسائل، مذہبی کتابیں... یہ سب دفنانا ہوں گے۔"

میری قسمت بھی انہی کے ساتھ بندھ گئی۔

ایک بائیسکل کی آپ بیتی

میں ایک زنگ آلود، دم توڑتی ہوئی سانس ہوں، جسے لوہے کی بھٹی کے حوالے کیے جانے کا انتظار ہے۔ میرے اردگرد، زندگی سے محروم دھات کے ٹکڑے پڑے ہیں— کہیں کار کا پرانا بمپر ہے، کہیں پنکھے کے پر، کہیں کسی یادگار تالے کا شکستہ جسم۔ ہم سب، جیسے کسی بے نام قید خانے کے قیدی ہوں، جنہیں سزائے موت سنادی گئی ہو، اور اب ایک آخری رات کی مہلت ملی ہو۔

میں بائیسکل ہوں— نہیں، صرف بائیسکل نہیں، میں وقت کا ایک پہیہ ہوں، ایک عہد کا نشان، ایک سفر کی تمثیل۔ آج میں کسی کونے میں اوندھے منہ پڑا ہوں، میری زنجیریں کٹ چکی ہیں، میرے پہیے جم چکے ہیں، اور میرے جسم کی ہڈیوں میں وہی زنگ پھیل چکا ہے جو انسانی دلوں میں مایوسی بن کر سرایت کرتا ہے۔

آج جب بھٹی کی دھیمی دھیمی آگ مجھے اپنی جانب بلاتی ہے، تو میرے اندر ایک نا تمام کہانی، ایک ادھوری نظم، ایک بینام غزل تڑپتی ہے۔ میرے ساتھ پڑی یہ کرسی کی ٹوٹی ٹانگ، یہ پنکھے کا بے جان پر، یہ سب میرے سامعین ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ میرا جرم کیا تھا؟ میرا گناہ کیا تھا؟ کیا یہ کافی نہیں تھا کہ میں نے انسان کے جسم کو چلایا، اس کے ارادوں کو راستہ دیا، اور اس کے خوابوں کو رفتار بخشی؟

کیا وہ دن بھول سکتے ہیں جب میری دھات پر سورج چمکتا تھا، جب بچے میری گھنٹی کی آواز سن کر دوڑتے تھے، جب میرا وجود کسی کی شان کا استعارہ تھا؟ کیا وہ وقت بھول گیا جب مجھے صابن سے دھویا جاتا تھا، جب میرے پہیوں پر خوشبودار تیل چڑھایا جاتا تھا، جب میری زنجیروں کی کھنک کسی گیت کی مانند سنائی دیتی تھی؟

میں خاموشی سے سوچتا ہوں، جیسے کوئی قیدی اپنی زندگی کے وہ صفحات پلٹتا ہے جن پر وقت کی روشنائی سے خواب لکھے گئے تھے، اور جنہیں آنسوؤں کی نمی نے دھندلا دیا ہے۔

اور آج، اس آخری لمحے میں، میں چاہتا ہوں کہ اپنی کہانی سناؤں، اپنی زندگی کے اوراق پلٹوں، اپنے نشیب و فراز بیان کروں۔ وہ لمحے جب میں زمین کے اندر دفن ایک بے نام لوہے کی شکل میں موجود تھا، اور وہ لمحہ جب میں ایک شوروم کی شفاف کھڑکی میں آویزاں تھا۔

میرے ساتھ بیٹھے ہوئے خاموش ساتھیو، اے دھات کے بے جان اجسام، سنو! سنو وہ کہانی جو تم میں سے کسی نے نہ دیکھی، نہ سنی، نہ جانی۔ میں تمہیں وہ سفر سناؤں گا جو میں نے کیا، مٹی سے دھات تک، اور دھات سے خوابوں تک۔

بھٹی کی تپش مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے، مگر اس سے پہلے کہ میں اس کی گود میں پگھل جاؤں، میں چاہتا ہوں کہ میری آواز، میری کہانی، میری موجودگی کی گواہی دے جائے۔

سنو، میں بائیسکل ہوں۔ ایک خواب دیدہ پہیہ۔ اور یہ میری آپ بیتی ہے۔

تم سمجھتے ہو میں محض ایک مشین ہوں؟ چند پیچ، زنجیروں، اور پہیوں کا مجموعہ؟ نہیں! میں ایک روح رکھتا ہوں، ایک یاد، ایک ماں کی کوکھ سے جنم لینے والی تخلیق کی مانند۔

میری پیدائش کی کہانی زمین کی آغوش سے شروع ہوتی ہے۔ میں صدیوں سے خامشی کی چادر اوڑھے، پہاڑوں کی تہہ میں دفن ایک معمولی پتھر کی مانند تھا— ایک ایسا لوہا جو اپنی شناخت سے ناآشنا تھا، جو صرف ایک بے رنگ، بے نام وجود تھا۔

لیکن زمین ماں ہوتی ہے۔ وہ جانتی ہے کب کس بیٹے کو وقت کی روشنی دکھانی ہے۔ ایک دن— شاید کسی مزدور کی دعاؤں کا دن، یا کسی انجینئر کے خوابوں کا آغاز— زمین کانپ اٹھی۔ دھماکوں، کلہاڑوں اور ڈرلوں کی آوازوں نے میرے خالی وجود میں پہلی سانسیں بھریں۔ میں ایک کان سے نکالا گیا۔ ایک کان کن کے جھریوں بھرے ہاتھوں نے مجھے چھوا، اور میری خامشی ٹوٹ گئی۔

مٹی سے لت پت، دھول میں لپٹا، میں دوسرے پتھروں کے ہمراہ ایک لوہے کے کنویں کی طرف بڑھایا گیا۔ وہاں مجھے ایک بھٹی کے حوالے کیا گیا۔ وہ بھٹی... آگ کا وہ دہکتا دریا، جس میں ہر عنصر اپنی اصل کھو دیتا ہے تا کہ نیا روپ پا سکے۔ میں بھی پگھلا، میری سختی مائع بن گئی، میری انا بہہ نکلی، اور میں ایک سیال وجود میں ڈھل گیا۔

آگ، جو سب کچھ جلا دیتی ہے، مجھے زندگی دے رہی تھی۔

پھر ایک سانچے میں مجھے انڈیلا گیا۔ وہ لمحہ جیسے کسی مصور نے میرے وجود کو نقش کیا ہو۔ میں ایک مستطیل دھات کی چادر میں ڈھل چکا تھا۔ ہموار، چمکدار، اور تازہ جنم لیا ہوا۔ اس لمحے، مجھے پہلی بار "وجود" کا احساس ہوا۔ میں اب صرف لوہا نہ تھا، میں ایک امکان تھا، ایک خواب۔

میرے بعد، مجھے صاف کیا گیا، میری سطح کو صیقل کیا گیا۔ مشینوں نے مجھے کاٹا، تراشا، جھاڑا، اور میری ہڈیوں میں مضبوطی کی روح پھونکی۔ میں اب وہ خام پتھر نہ رہا جو پہاڑ کی تہہ میں سوتا تھا — میں ایک تیار شدہ دھات کا ٹکڑا تھا۔

کبھی کبھی میں سوچتا ہوں، ہر مرحلہ، ہر تکلیف، ہر آگ کی لپٹ... کیا یہ سب کسی تقدیر کی تیاری تھی؟ کیا مٹی سے دھات تک کا یہ سفر، انسان کے زمین سے آسمان تک پہنچنے کا استعارہ نہیں؟ جیسے آدم کو مٹی سے بنایا گیا، ویسے ہی مجھے بھی بنایا گیا۔ جیسے انسان کو شعور کی بھٹی سے گزار کر خلیفۃ الارض بنایا گیا، مجھے بھی جلایا گیا، پگھلایا گیا، اور سنوارا گیا۔

میرے ساتھ دوسری دھاتیں بھی تھیں — کچھ میری جڑواں بہنیں، جو کسی جہاز کا پر بنیں، کچھ جو کسی عمارت کی چھت بنیں، اور کچھ جو توپ کے دہانے میں جا چھپیں۔ مگر میری تقدیر، میرے سفر کا نقش، ایک سواری بننا تھا۔ ایک ایسی سواری جو نہ صرف جسم کو حرکت دے، بلکہ یادوں کو بھی رواں کرے۔

جب میں لوہے کی چادریں بن چکا، تو مجھے ایک ٹرک میں ڈال کر بائیسکل بنانے والے کارخانے کی طرف روانہ کیا گیا۔ راستے میں میں نے

کھیتوں، درختوں، بستیوں اور انسانی زندگیوں کو دیکھا۔ مجھے لگا جیسے میں خواب سے جاگ چکا ہوں، اور اب دنیا کا حصہ بننے جا رہا ہوں۔

زمین کی کوکھ سے نکل کر، آگ میں پگھل کر، مشینوں کے ہاتھوں تراش کر، میں اب اس لمحے کی دہلیز پر کھڑا تھا جہاں میں بائیسکل میں ڈھلنے والا تھا۔ مگر یہ محض جسمانی تبدیلی نہ تھی — یہ روح کی تجدید تھی۔

جب مجھے کارخانے میں داخل کیا گیا، تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی مقدس عبادت گاہ کے آستانے پر قدم رکھا ہو۔ یہاں ہر

چیز ایک مخصوص ردھم میں سانس لیتی تھی — مشینوں کی گرجتی ہوئی آواز، لوہے کی چمکدار مہک، اور کاریگروں کے ہاتھوں کی جنبش، سب کچھ مجھے بتا رہا تھا کہ میں محض دھات نہیں رہا، میں اب فن بننے جا رہا ہوں۔

یہاں وقت نہ صرف گزرتا تھا، بلکہ تخلیق کرتا تھا۔ ہر گھڑی ایک وجود کو سنوارتی، ہر لمحہ کسی نئے خواب کو مجسم کرتا۔ مجھے ڈھانچے کے طور پر کاٹا گیا — ایک ڈنڈا، ایک دھرا، ایک بنیاد۔ جیسے کسی معمار کی انگلیوں سے مسجد کی محراب ابھرتی ہے، ویسے ہی میرے ڈھانچے کی گولائیاں تراشی جا رہی تھیں۔

پھر میرے پہیے تیار کیے گئے — دو دائرے، جو گویا زندگی کے ازلی تسلسل کی علامت ہوں۔ ان میں تار باندھے گئے، جیسے وقت کی ڈور سے قسمت بُنی جا رہی ہو۔ ہر تار، ایک نغمہ، ایک دعا، ایک خاموش عہد۔ ان تاروں کی کھنک میں مجھے اپنی دھڑکن سنائی دی — میں سانس لے رہا تھا۔

اس کے بعد میری زنجیر بنی۔ ایک ایک کڑی، جیسے تقدیر کے الفاظ ہوں، جو میرے سفر کی تحریر کو مکمل کر رہی ہو۔ زنجیر نہ ہو تو پہیے بے کار، اور اگر تقدیر نہ ہو تو زندگی بے منزل۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں صرف حرکت نہیں، ترتیب ہوں — ایک ایسا نظام جو کمال سے جڑا ہے۔

میری ہینڈل شان سے تراشی گئی۔ اس پر چمڑے کی نرم تہہ چڑھائی گئی — جیسے کسی شاعر کی انگلیوں پر قلم کی گرفت ہو۔ میری نشست کو نرم گداز کپڑے سے ڈھکا گیا، تاکہ میرے اوپر بیٹھنے والے کو آرام ملے — یہ میری پہلی قربانی تھی۔

رنگ کا مرحلہ آیا، تو میری سانس تھم گئی۔ کاریگر نے مجھے ایک چمکدار نیلا رنگ دیا — جیسے نیلے آسمان کی وسعت کو میرے جسم پر انڈیل دیا ہو۔ اس رنگ نے مجھے نیا لباس بخشا، جیسے کسی دلہن کو عروسی جوڑا پہنایا جائے۔ جی دلہن!

آپ حیران ہون گے کہ پہلے میں "تھا" اور اب " تھی"!

یہاں میں نیا یک اور تبدیلی محسوس، میرا جی چاہا کہ میں خود کو مونث کے طور پر پیش کروں حالانکہ میری کوئی جنس نہیں میں آئینے میں خود کو دیکھ کر چونک گئی — یہ میں تھی؟ ایک عام سی دھات، اب خوابوں کا استعارہ؟

پھر میری گھنٹی نصب کی گئی۔ اس کی آواز پہلی بار فضا میں گونجی، تو مجھے لگا جیسے میں بول پڑی ہوں۔ جیسے صدیوں کی خاموشی ٹوٹ گئی ہو۔ اب میں نہ صرف چل سکتی تھی، بلکہ بول بھی سکتی تھی — ایک پکار، ایک پیغام، ایک پرانی گلی میں دوڑتے بچے کی ہنسی جیسی گھنٹی!

آخر کار، جب میں مکمل ہوگئی، تو مجھے شوروم کی طرف روانہ کیا گیا۔ مجھے ایک شفاف ٹرک میں بٹھایا گیا، جیسے کسی

راجکماری کو پالکی میں لے

جایا جاتا ہے۔راستے میں میں نے دنیا دیکھی—اسکول جاتے بچے،کام پر جاتے مزدور،کھیتوں میں ہل چلاتے کسان،اور میرے جیسا لوہا جو ابھی خاک میں سو رہا تھا۔

شوروم... وہ ایک عجیب دنیا تھی۔شیشوں کی دیواروں کے پیچھے چمکتے ہوئے خواب قطاروں میں کھڑے تھے۔ہر بائیسکل اپنی جگہ پر بے حد خوبصورت،مگر میری نگاہوں میں سب سے مختلف میں خود تھی۔میری گھنٹی،میرا رنگ،میری زنجیر—سب کچھ مجھے ممتاز کرتا تھا۔میں اکڑی کھڑی تھی،جیسے کسی فوجی کی پریڈ میں پہلی صف میں شامل ہوگئی ہوں۔لوگ آتے،مجھے دیکھتے،سراہتے،کچھ میری گھنٹی بجاتے،کچھ میرے ہینڈل کو چھوتے۔بچوں کی آنکھیں چمک جاتیں،مرد حسرت سے دیکھتے،اور عورتیں "واہ" کہہ کر گزر جاتیں۔میں اب خواہش بن چکی تھی۔میں خواب بن چکی تھی۔

مگر ایک دن،ایک شخص آیا—سفید وردی میں ملبوس،اس کے ساتھ ایک سلیقہ مند نوجوان،اور چند اہلکار۔وہ ایک افسر تھا—تمکنت اس کی چال میں،غرور اس کے لہجے میں،اور تفاخر اس کی آنکھوں میں۔اس نے مجھے بغور دیکھا،میرے ٹائر کو ہاتھ لگایا،میری زنجیر کو گھمایا،اور بس،فیصلہ صادر ہوا—"یہی چاہیے۔"

میں خرید لی گئی۔

مجھے گاڑی میں رکھا گیا—ہاں،گاڑی،ایک لمبی سی غیر ملکی گاڑی،جس میں میں براجمان تھی۔میرے چمک دار ڈھانچے پر شوروم کے عکس پڑ رہے تھے اور میں خود کو آئینے میں دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میں فقط ایک بائیسکل نہیں،ایک مقام ہوں،ایک شناخت ہوں،ایک امتیازی کا نشان ہوں۔

افسر کا گھر جیسے کسی تصویری کتاب سے نکلا ہوا خواب تھا۔بیرونی دروازے پر وردی میں ملبوس چوکیدار،باغیچے میں غیر ملکی گھاس،اور اندرونی حصے میں وہ طرزِ زندگی جو عام انسان صرف فلموں میں دیکھتا ہے۔دیواروں پر مغربی آرٹ کے نقش،پردوں پر ولایتی مہریں،قالینوں پر نرم نرم پرزے اور ہر گوشے میں "ہم الگ ہیں" کی سرگوشی۔

مجھے ایک مخصوص جگہ دی گئی،جہاں صرف "ورزش کے لیے مخصوص اشیاء" رکھی جاتی تھیں—ایک ولایتی ربر والی رسّی،دو لوہے کے ڈھیلے،ایک پرانی لیکن قیمتی ٹینس ریکیٹ،اور اب میں۔میں ان میں سب سے چمکدار،سب سے متحرک تھی۔

صاحب اکثر صبح کی ہلکی روشنی میں مجھے نکالتے۔ان کے جاگنے سے پہلے ملازم میری صفائی کرتے،میرے پہیوں کو

چیک کرتے، زنجیر پر تیل لگاتے، اور مجھے اس انداز سے پیش کرتے جیسے کسی شہزادی کی پالکی کو روانگی سے قبل چمکایا جاتا ہے۔ جب وہ مجھے سوار ہوتے، تو ان کی وردی جھلملاتی، سن گلاسز آنکھوں پر ہوتے، اور پسینے سے زیادہ خوشبو ان کے جسم سے اٹھتی۔

چلتے ہوئے مجھے احساس ہوتا کہ میرے پہیوں تلے صرف زمین نہیں، پورے معاشرے کا تفاوت کچلا جا رہا ہے۔ گلی کے بچے مجھے حسرت سے دیکھتے، ریڑھی والے کی آنکھوں میں خواہش ابھرتی، اور مزدور اپنی کمر سیدھی کرتے ہوئے میری طرف نگاہ کرتے۔ میں ان سب کی نظروں میں فقط ایک سواری نہیں، ایک خواب، ایک دُور افتادہ خواہش تھی۔

صاحب کے دوست بھی انہی جیسے تھے — سب غیر ملکی الفاظ کے پرستار، ہر چیز میں "انگریزی" کا ذائقہ تلاش کرنے والے۔ ایک دن ایک مہمان نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا، imported?"it"Is

صاحب مسکرا کر بولے، one."likelooksitbut"No,

میرے اندر ایک عجیب سا فخر جاگا۔ میں ولایتی نہ سہی، مگر میں نے اُن ولایتی چیزوں کے بیچ جگہ بنائی تھی، اور یہی میری کامیابی تھی۔

مگر غرور کے محل میں خلوص کا پانی کم ہی بہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ صاحب کا شوق کم ہوتا گیا۔ اب وہ اکثر تھکے تھکے سے مجھے دیکھتے، اور کئی دنوں تک میری گھنٹی بجائے بغیر دفتر چلے جاتے۔ ایک دن، جب ان کے ایک ماتحت پولیس افسر نے کسی کام کے دوران ان کے لیے بڑی خدمت کی، تو صاحب نے ہنستے ہوئے کہا،

health."forgoodIt'sson?yourforbicyclethistakeyoudon't"Why

اور یوں، میں اشرافیہ کے دالان سے عوام کی دہلیز پر پہنچ گئی۔

پولیس افسر مجھے لینے خود آئے۔ ان کی آنکھوں میں چمک تھی، وہ بار بار میرے فریم کو دیکھتے، پہیوں کو گھماتے، اور حیرت سے بولتے، "صاحب نے واقعی مجھے یہ دی؟"

جب مجھے پولیس افسر کے گھر لایا گیا، تو پہلا تاثر خامشی کا تھا — ایسی خامشی جو بلند آواز کے شور سے کہیں زیادہ کہانیوں سے بھرپور ہوتی ہے۔ یہاں نہ کوئی چمکتی چمکتی اینٹیں تھیں، نہ ولایتی صوفے، نہ خوشبوؤں سے لبریز پردے۔ لیکن یہاں ایک چیز تھی جس کا وجود اشرافیہ کے محلوں میں ناپید ہوتا ہے — خلوص۔ اور وہ ہر اینٹ، ہر دروازے، ہر سانس سے جھلک رہا تھا۔

مجھے گھر کے اندرونی صحن میں ایک چھوٹے سے چھتر کے نیچے رکھا گیا۔ وہ صحن جس میں ایک جانب پودے قطار میں کھڑے تھے، جیسے سلامی دینے آئے ہوں، اور دوسری جانب دو بچے ہنستے کھیلتے پھر رہے تھے۔ میرے نئے مالک، وہ پولیس افسر، جنہیں صاحب نے "تحفہ" کے طور پر مجھے دیا تھا، ایک سیدھے سادھے انسان تھے — ایسے جیسے کسی اردو نظم کا دیباچہ، بے ساختہ اور خالص۔

ان کی وردی پر استری کے نشان واضح تھے، جوتے معمولی مگر چمکدار، اور آنکھوں میں ایک ایسی روشنی جو صرف دیانت دار لوگوں کی آنکھوں میں بس سکتی ہے۔ انہوں نے میری طرف دیکھا، جیسے کوئی بزرگ کسی وارث کو عطا کی گئی گھڑی کو دیکھتا ہے — احتیاط، محبت اور ذمہ داری سے۔

پہلی بار ان کے چھوٹے بیٹے نے میری گھنٹی بجائی۔ وہ آواز... وہ کھنک... جو کبھی فخر کا ترانہ ہوا کرتی تھی، اب معصوم خوشی کا قہقہہ بن چکی تھی۔ میرا دل — اگر ہوتا — تو شاید دھڑک اٹھتا۔ میں نے خود کو اپنے جسم کے اندر مسکراتا ہوا محسوس کیا۔

اس گھر میں کوئی خادم نہیں تھا، صرف خلوص کے خدمت گار تھے۔ میری صفائی خود افسر کا بیٹا کرتا، روز صبح میرے فریم پر نم کپڑا پھیرتا، میرے

ٹائروں کو چیک کرتا، اور زنجیر کو انگلی سے ہلا کر سنتا کہ کھنک درست ہے یا نہیں۔ ہر ہفتے میرے پیچ کس کر کسے جاتے، رنگ میں اگر خراش آجاتی تو ماں چپکے سے نیل پالش سے چھپا دیتی۔

یہ وہ لوگ تھے جو ایک ایک روپے کی قدر جانتے تھے۔ تنخواہ معمولی، مگر خوشی بے حساب۔ افسر صاحب کبھی کسی سے رشوت نہ لیتے، نہ دینے کا سوچتے۔ وہ اکثر کہتے، "حلال کی کمائی سے جو ملے، وہی کافی ہے، باقی تو دل کی بھوک ہے۔"

گھر میں اخلاق، تہذیب اور محبت کی فضا تھی۔ بچوں کے لہجے میں ادب، بیوی کے رویے میں وفا، اور خود افسر کے عمل میں امانت۔ وہ جب بھی مجھے دفتر لے کر جاتے، لوگ دیکھ کر کہتے، "افسر ہے، مگر سادگی دیکھو"!

میں فخر سے اپنے پہیے گھماتی، جیسے کوئی خادم اپنے آقا کی خدمت میں جھک کر فریضہ ادا کر رہا ہو۔

اس دوران میرے دن بھر خوشیوں سے لبریز گزرنے لگے۔ بچوں نے مجھ پر بیٹھ کر سائیکل چلانا سیکھا، افسر صاحب نے مجھے دفتر جانے کے لیے استعمال کیا، اور کئی بار اہلِ محلّہ نے مجھے مانگ کر استعمال کیا۔ میں اب صرف ایک سواری نہ

تھی — میں محلے کا حصہ بن چکی تھی، ایک مددگار، ایک یاد، ایک خدمت گزار۔

یہ خاندان... یہ محلّہ... میرے لیے کسی جنت سے کم نہ تھا۔ یہاں ہر شخص دوسرے کی فکر میں مبتلا تھا۔ کبھی کسی بوڑھے کو دوا لینے لے جایا گیا، کبھی کسی اسکول جانے والے بچے کو میرے پیچھے بٹھایا گیا۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار انسانیت کا اصل رنگ دیکھا۔ وہ رنگ جو نہ مصنوعی ہوتا ہے، نہ قیمتی — صرف دلوں سے پھوٹتا ہے۔

سالوں بیت گئے۔ میں پرانی ہوتی گئی، میرے رنگ میں خراشیں بڑھتی گئیں، زنجیر کبھی کبھی اکھڑتی، پہیے کڑکڑاتے، مگر پھر بھی میں چلتی رہی۔ ہر دن ایک نئی کہانی، ہر راستہ ایک نئی دعا۔

پھر ایک دن، افسر صاحب ریٹائر ہوئے۔ ان کی آمدنی کم ہوگئی، بچے بڑے ہوگئے، کچھ باہر چلے گئے، اور وہ خود بڑھاپے کے سائے میں داخل ہونے لگے۔ میرے پرزے اب تھکنے لگے تھے۔ میں خود بھی اب پہچان سے ہٹ کر ایک بوسیدہ یاد بن چکی تھی۔

چند مہینے مزید بیتے، اور ایک دن گھر کے بڑے بیٹے نے فیصلہ کیا "— ابو، یہ سائیکل بہت پرانی ہو چکی ہے، اسے بیچ دیتے ہیں۔"

میری گھنٹی ساکت ہوگئی، زنجیر لرزنے لگی، پہیوں میں ایک ہلکی سی کپکپی دوڑ گئی۔ کیا میں اب ختم ہونے جا رہی ہوں؟ مگر پھر، مجھے ایک جھونپڑی والے "کباڑیے" کے حوالے کیا گیا۔ وہ میرے ڈھانچے کو دیکھ کر بولا،

"بڑی خدمت کی ہے اس نے... چلو، ایک بار پھر چمکاتے ہیں۔"

اس نے میرے پرزے الگ کیے، زنگ صاف کیا، رنگ لگایا، پہیوں میں ہوا بھری، اور مجھے بازار لے جا کھڑا کیا۔

اور پھر ایک دن، ایک دبلے پتلے، سر پر سرخ ٹوپی پہنے، آنکھوں میں تھکن چھپائے ہوئے شخص نے مجھے خریدا۔ اس کی چال میں شگفتگی نہ تھی، مگر اُس نے مجھے ہاتھ میں لیتے ہی وہ جملہ کہا جو مجھے آج تک یاد ہے:

"میرے ہنر کو ایک پرزہ چاہیے تھا... اب تماشا مکمل ہوگا۔"

میں حیران تھی۔ نہ کوئی دفتری فائل، نہ کوئی دفتر کا گیٹ، نہ کوئی بچہ جو مجھے سکول لے جائے۔ بس یہ ایک عجیب سا انسان، جس کی آنکھیں ہنستی تھیں اور پلکیں روتی تھیں۔

مجھے ایک چھوٹے سے خیمہ نما کیمپ میں لے جایا گیا۔ وہ جگہ سرکس کا "پیچھے کا منظر" تھی — جہاں قہقہوں کے خریدار نہیں، بیچنے والے بستے تھے۔ وہاں بندر تھے، جو اپنی عمر سے زیادہ کام کرتے تھے؛ ہاتھی تھے، جو وزن سے زیادہ غم

اٹھاتے تھے؛ اور وہ انسان، جو خود کو رنگ برنگے کپڑوں میں چھپا کر ہنسی بیچتے تھے، اور اندر سے ٹوٹے ہوئے پیالے کی مانند تھے—خالی، مگر چمکتے۔

میرے نئے ساتھی کا نام شمّی تھا۔ سب اُسے "شمّی مسخرہ" کہتے تھے، مگر میں اُسے اپنے دل میں "غم کا بادل" کہتی تھی۔ وہ ہر رات مجھے سجا کر میدان میں لے جاتا، میرے ہینڈل پر رنگین جھنڈیاں باندھتا، میری سیٹ پر گھنٹیاں لٹکاتا، اور مجھے قوسِ قزح کی مانند آراستہ کرتا۔

سرکس کا میدان... وہ جگہ جہاں حقیقت چھپائی جاتی ہے، اور فریب کو روشن کیا جاتا ہے۔ جب شمّی مجھے لے کر میدان میں آتا، تو تالیوں کا شور گونج اٹھتا، بچے قہقہے لگاتے، اور عورتیں تالیاں بجاتی تھیں۔ شمّی میرے ساتھ کرتب کرتا—کبھی مجھے ایک ٹانگ سے چلاتا، کبھی الٹا بیٹھ کر گھماتا، کبھی مجھے ہوا میں اچھالنے جیسا تاثر دیتا۔

میں ان قہقہوں کو سنتی، مگر میری زنجیر میں سسکیاں چھپتیں۔ شمّی کے ہونٹ ہنستے، پر آنکھیں بار بار نمی سے بھر جاتیں۔ شو ختم ہونے کے بعد، وہ خاموشی سے مجھے واپس کیمپ میں لے جاتا، مجھے آرام دہ جگہ پر رکھتا، اور خود ایک پرانی دری پر لیٹ کر آسمان کو دیکھتا رہتا۔

ایک رات میں نے اس کی خاموشی کی آواز سنی، وہ مجھ سے کہہ رہا تھا:

"تو بھی میرے جیسی ہے ناں؟ دکھ چھپا کر خوشیاں بکھیرتی ہے؟"

میں خاموش تھی۔ شاید ایک بائیسکل کے پاس الفاظ نہیں ہوتے، مگر اس کے پہیوں میں درد کی گردش ضرور ہوتی ہے۔

شمّی کا ماضی بھی ایک ادھورا افسانہ تھا۔ وہ کسی وقت اسکول میں اردو پڑھاتا تھا۔ معاشرتی ناہمواریوں، غربت، اور بیروزگاری نے اسے اس حال میں پہنچا دیا تھا کہ اب وہ ہنسی بیچنے پر مجبور تھا۔ اُس کا ایک بیٹا تھا جو بیمار رہتا تھا، دوا کے پیسے نہیں تھے، تو وہ ہر رات تالیوں کی قیمت پر دوا کا بندوبست کرتا۔ لوگ ہنستے تھے، وہ روتا تھا۔ لوگ تالیاں بجاتے رہتے، اور وہ اندر سے بکھرتا رہتا۔

کبھی کبھی، جب وہ مجھے صاف کرتا، تو ایسے مسکراتا جیسے میں اس کی شریکِ حیات ہوں، جس کے سامنے وہ سب کچھ کہہ سکتا ہے۔

"بائیسکل، تمہیں نہیں پتہ... جب ہم تماشا کرتے ہیں ناں، تو ہم اصل میں بھوک کو مسکرا کر چھپاتے ہیں۔ تم بھی میرا ساتھ دیتی ہو۔ تم بھی تو خود کو روشن رکھتی ہو، حالانکہ تم بھی تو اندر سے ٹوٹ چکی ہو۔"

میں شرمندہ سی ہو جاتی۔ کاش میں انسان ہوتی، کاش میں اس کا دکھ بانٹ سکتی۔ مگر میں کیا کر سکتی تھی؟ صرف اتنا کہ جب وہ مجھے چلائے، میں شور نہ مچاؤں، میں روانی سے چلوں، میں اس کا بوجھ نہ بڑھاؤں۔

مہینے گزرتے گئے۔ شمّی نے میرے ساتھ کئی یادگار کرتب کیے۔ لوگ اسے سرکس کا ستارہ کہتے، مگر وہ خود کو جلتا ہوا پتنگا محسوس کرتا تھا — روشنی

کے پیچھے دوڑتا ہوا، جو ہر بار اس کو راکھ کی طرف لے جاتی۔

پھر ایک دن، موسم سرد ہونے لگا، سرکس کا سیزن ختم ہو گیا۔ تماشے بند، تالیاں خاموش، اور قہقہے ویران ہو گئے۔ شمّی کی آنکھیں خالی ہو گئیں۔ ایک دن اس نے میرے فریم کو دیکھا، آہ بھری، اور کہا:

"اب تُو بھی تھک گئی ہے... تیرے پرزے کمزور ہو چکے، تیرے پہیے لڑکھڑاتے ہیں۔ میں بھی تھک گیا ہوں۔"

میں لرز اٹھی۔

دو دن بعد، وہ مجھے ایک اور کباڑیے کے حوالے کر آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، لیکن وہ زبردستی ہنس رہا تھا۔

"اب شاید تُو کسی اور کا تماشا بن جائے گی"...

وہ آخری بار میری گھنٹی بجا کر چلا گیا۔

اور میں... خاموش کھڑی رہ گئی، ایک بوسیدہ وجود، جو قہقہوں کے بوجھ سے دبا ہوا تھا۔ میرے اندر نہ کوئی ہنسی بچی تھی، نہ کوئی کرتب، نہ کوئی جوکر۔

اب میں صرف ایک جسم تھی — زنگ آلود، کمزور، بوجھل۔

اب میں ایک بھٹی کے کنارے پڑی ہوں۔ میرا لوہا ٹھنڈا نہیں، مگر زندگی کی حدت کھو چکی ہے۔ وہ مزدور جو مجھے گھسیٹ کر یہاں لایا، میرے پہیوں کی چرچراہٹ پر ایک لمحے کو رکا، پھر کندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا — گویا میں کوئی بے جان شے نہیں بلکہ ایک ثقیل یاد ہوں۔

میری زنجیروں میں بچوں کی ہنسی بندھی تھی، میرا ہینڈل اب بھی شمّی کی انگلیوں کا لمس یاد کرتا ہے، اور میرے فریم میں وہ خراشیں اب بھی باقی ہیں جو اسکول کے در و دیوار سے لگی تھیں۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی میری آواز سن لے، کوئی میرے گزرے لمحوں کو پڑھ لے جیسے کوئی کسی پرانے خط کو محبت سے کھولتا ہے۔

لیکن یہاں... ہر چیز جلائی جاتی ہے، تاکہ نئی بنائی جا سکے۔

میں دھیرے دھیرے آگ کی طرف سرک رہی ہوں، جیسے کوئی بزرگ خود اپنی قبر کی طرف قدم بڑھاتا ہے۔سورج کی آخری کرن میرے بوسیدہ ڈھانچے پر پڑتی ہے، اور مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی آخری بار مجھے الوداع کہہ رہا ہو۔

میری گھنٹی، جو کبھی قہقہوں کا سبب بنتی تھی، اب آخری بار بجتی ہے—مدھم، بوجھل، جیسے کوئی پرانی لوری۔

آگ میری زنجیروں تک آ پہنچی ہے۔

میں جل جاؤں گی۔

پر میرے اندر کی کہانی...

شاید کسی اور بائیسکل میں جنم لے گی۔